

اماں گھر میں کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ہم لوگ کبھی گھر سے اتنی دیر تک باہر نہیں رہے۔ اب مجھے جانا ہوگا۔“

میرادل جیسے کسی نے آری سے کاٹ کر رکھ دیا ہو۔ تو اس خواب کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ ایمان جاری تھی۔ میں نے اس سے کچھ دیر اور رکنے کی التجا کی۔ جواب میں بے بسی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ نہیں رک سکتی تھی۔

کاش قدرت ہمیں وقت کو اپنی مرضی سے روکنے کا کوئی کلیہ بھی بتا دیتی۔ تو میں آج سات زمین اور آسمان کے خزانے دے کر بھی بدلے میں صرف چند پل اور سمیٹ لیتا۔ اتنے میں باہر کسی کے چلنے کی دستک ہوئی اور پھر کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ ایمان نے جلدی سے اپنی کالی شال سنبھالی۔ دروازے سے نگہت اور حیا کا چہرہ پل بھر کے لیے جھٹک دکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ بھی ہمیں اسی قاتل وقت کے گزر جانے کا احساس دلانے کے لیے آئی تھیں۔ ایمان نے بے چینی سے میری طرف دیکھا۔

”مجھے آپ کے وعدے کا انتظار ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

میں نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔

”گھر سے نکلتے وقت میں نے بھی اپنے آپ سے اور اپنے گھر والوں سے چند وعدے کیے تھے۔ مجھے ان کا بھرم بھی رکھنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کل کوئی میری محبت کی سچائی کو طعنہ دے۔ لیکن تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ تم جو چاہتی ہو۔ ویسا ہی ہوگا۔ بس مجھے کچھ وقت دے دو۔ کہیں میں اپنی نظروں میں ہی نہ گر جاؤں۔“ ایمان نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”خدا بخواتی۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

اس کے چہرے پر اب سکون کی پرچھائیں تھیں۔

”میں جانتی ہوں، آپ میرا مان کبھی نہیں توڑیں گے۔“

وہ جانے کے لیے پلٹی، میرادل چاہا کہ دوڑ کر اُسے اپنی باتوں کے حصار میں لے لوں۔ ہمیشہ کے لیے، اور اُسے یہاں سے کبھی واپس نہ جانے دوں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ سخت ضبط کے باوجود اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسو بھر ہی آئے تھے۔ ایک لمحے کو ہماری نظر ملی۔ اور وہ پلٹ کر باہر چلی گئی۔ میں بے چین

لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس پہلی اور آخری کوشش کو لا حاصل نہیں جانے دیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ آئندہ جب کبھی زندگی میں آپ کا نام کسی حوالے سے سامنے آئے تو اس کے ساتھ یہ جوگ کی، یہ خود کو جلا کر رکھ کر دینے والی باتیں نہ ہوں۔ میں اپنی خوشی کے لیے آپ سے آپ کی خوشی مانگنے آئی ہوں۔“

میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھ سے میری جان مانگی ہوتی جس پر کم از کم میرا اختیار تو ہے، مجھ سے وہ نہ مانگو جو خود میرے بس میں نہیں ہے۔“

”کیوں۔۔۔ کیا زندگی اس ایک ملاقات کے سہارے نہیں کاٹی جاسکتی؟ کیا چند سالوں کا یہ محدود سفر صرف اسی ایک ملاقات کی یاد میں بسر نہیں ہو سکتا؟۔۔۔ مجھے پورا یقین ہے۔۔۔ میں یہاں نہیں تو نہ سہی۔۔۔ پر وہاں اگلے جہاں میں ضرور آپ کے ساتھ ہوں گی۔۔۔ بس اتنا سا وعدہ نہیں دے سکتے مجھے آپ۔“

اس کی باتوں نے اس نازک سی گل رخ کے اعتماد اور یقین نے مجھے لا جواب سا کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کس کرب سے گزر رہی ہے، وہ بے چاری تو اتنی بے بس ہے کہ گناہ کے احساس کی وجہ سے اپنی محبت کا اظہار بھی کھل کر نہیں کر پائی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ان لمحوں میں مجھے گناہ و ثواب اور سزا و جزا کے اس تصور سے ہی شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ مجھے پھر ایسا لگا کہ جیسے مذہب میری محبت پر ایک مرتبہ پھر ڈاکا مار رہا ہو۔

باہر کی تیز بارش، چھت پر گرنے والی بوندوں کی مسلسل ٹپ ٹپ اور اندر بڑھتے اندھیرے میں جلتی شمعوں کے لرزتے سائے۔ ایسے میں اس پری رخ کا ساتھ، وہ ویسے ہی کاہلی ہوئی بے چین اور بے کل سی گھٹنے جوڑے بیٹھی تھی۔ اس کی وہ شریر لٹ گیلی ہو کر پھر سے لٹک کر اس کے زخماں چو منے لگی تھی۔ میں بے خودی میں اپنا ہاتھ روک نہیں سکا اور میں نے اپنی انگلیوں سے اس کی لٹ کو زخماں سے ہٹا کر ماتھے پر پرے کر دیا۔ اُس نے ایک دم گھبرا کر مجھے دیکھا اور شرم سے دوہری ہو گئی اور پھر جیسے ہی اس کی نظر دیوار پر لگے قدیم گھڑیال پر پڑی تو ایک دم بوکھلا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

”اف۔۔۔ اتنی دیر ہو گئی۔۔۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔ اندھیرا ہونے کو ہے۔“

۔۔۔۔۔ اس کے بارے میں، میں نے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ کبھی سوچتا تھا نگہت کے ذریعے اسے ایک جھوٹا پیغام بھجوا کر کہ میں گھر واپس چلا گیا ہوں، ہمیشہ کے لیے یہ شہر ہی چھوڑ دوں۔ اس کی تسلی اور تصدیق کا ذریعہ صرف نگہت ہی تھی اور نگہت میری خاطر یہ جھوٹ بولنے پر بھی تیار ہو ہی جاتی۔ اور پھر شاید یہ ہمارا آخری جھوٹ ہی تو ثابت ہوتا۔ پھر جانے کیوں اس بات پر مجھے خود ہی اپنے آپ پر شرم آ جاتی۔ اس معصوم اور پری صفت لڑکی سے اتنا بڑا جھوٹ، جو صرف میری محبت کی لاج اور بھرم رکھنے کے لیے اپنی ساری زندگی کی کمائی لٹا کر میرے پاس چلی آئی تھی۔ صرف اس بھروسے پر کہ میں اس کی بات ضرور رکھوں گا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا جاتا تھا۔ وہ اس دن کہہ گئی تھی کہ کیا ساری زندگی بس ایک ملاقات کے سہارے نہیں کاٹی جاسکتی؟ اب میں سوچتا تھا کہ ضرور کاٹی جاسکتی ہے۔ پر اس کے لیے مجھے جیسے کم ظرف کے لیے ایک اور شرط کا پورا ہونا بہت ضروری تھا۔ اور وہ یہ کہ مجھ سے اس ایک ملاقات کے بعد ہی میرے ہوش و حواس بھی چھین لیے جاتے۔ اُس سے ملنے کے بعد یہ کم بخت حافظہ ہی تو میرا سب سے بڑا دشمن ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ہفتہ بیت چکا تھا اُس سے ملاقات کیے ہوئے لیکن میری آنکھوں کے سامنے اب بھی ہر پل وہی بیٹھی رہتی تھی۔ میری سانسوں میں اب بھی اُسی کی وہ مانوس سی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میری ساعتوں میں اب بھی اس کی وہ روح کو کھینچ لینے والی ملائم آواز اور چوڑیوں کی کھنک ارتعاش بکھیر رہی تھی۔ میرے لمس کو اب تک اُسی کے جانفزاس کی عادت سی پڑی ہوئی تھی۔ یہ کیسی عجیب ملاقات تھی؟ کہ میں ان چند گھڑیوں کی ملاقات کے بعد اپنی اس سے پہلی گزاری ہوئی تمام عمر ہی بھول گیا تھا۔ میں اس ملاقات سے پہلے کیا تھا؟ میری پسندنا پسند کیا تھی؟ تمام ذائقے، تمام خوشبوئیں، تمام حیات جیسے مٹ سی گئی تھیں۔ مجھ سے میرا سایہ تک جیسے چھن گیا تھا۔ بس ایمان اور صرف ایمان ہی باقی رہ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے میرا وجود اسی دن اس دنیا میں وارد ہوا تھا جس دن میری ایمان سے وہ آخری ملاقات ہوئی اور شاید اسی دن میں فنا بھی ہو گیا تھا۔

وہ شاید ایمان سے ملے ہوئے نواں دن تھا۔ اکتوبر شروع ہو چکا تھا، سورج اب جلدی ڈوبنے لگا تھا اور ڈوبنے سے پہلے اس کی سنہری دھوپ ہلکی سردی میں بہت بھلی لگتی تھی۔ جیسے

ہو کر اس کے پیچھے لپکا، برآمدے میں نگہت اور حیا اُسے لینے کے لیے کھڑی تھیں، ایمان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ دونوں بھی خود پر قابو نہیں رکھ پائیں اور وہ دونوں بھی بس رو پڑنے کے قریب تھیں۔ مجھ دیکھ کر دونوں نے جلدی سے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ حیا میرے بالکل سامنے ہی ایمان کے ساتھ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس اجنبی اور انجانی سڑکی نے مجھ غیر کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ آج میری ایمان کو میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اس کے جھکے سر کی طرف اٹھ گیا۔ اپنے سر پر میرے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر کے اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور پھر مجھے اپنے سر پر ہاتھ رکھے دیکھ کر اس کا دل چھلک اٹھا اور وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میں نے اس کا سراپے شانے سے لگا کر اُسے تھپکا۔ شاید آج ساری کائنات ہی رو رہی تھی۔ برآمدے سے باہر آسمان آنسو بہا رہا تھا اور یہاں برآمدے میں نگہت اور حیا کی آنکھیں چھلک چھلک کر مینہ برسا رہی تھیں۔ باہر تانگے والے کا بگل بجا، حیا اور ایمان جلدی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ ایمان جاتے جاتے پلٹ پلٹ کر میری طرف دیکھتی رہی۔ اس لمحے شانیدار اُسے اپنی بڑی سی کالی شال بھی سنبھالنے کا دھیان نہیں تھا۔ اس کا مہتاب سا چہرہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ لکڑی کے پھانک پر آخری دفعہ میری کالی قسمت کے سیاہ آسمان پر چکا اور پھر ہمیشہ کے لیے بادلوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل برآمدے میں ہی بیٹھ گیا۔ میرا دل اتنی زور سے چیخنے کو چاہ رہا تھا کہ جس سے آسمان وز میں پھٹ جائیں۔

oo

اُس دن ایمان کے چلے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ عشق میں پالینے کی کک تو اس کک اور تڑپ سے کہیں زیادہ بڑھ کر اور کہیں زیادہ سوا ہوتی ہے جو عشق میں نہ پانے کی صورت میں مجھے ہو رہی تھی۔ مجھے کبھی کد بھی تو چین نہیں تھا۔ سچ ہے جنون میں وصل جدائی سے زیادہ زہریلا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مل کر میرے سینے کی آگ بجھنے کی بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھتی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ جیسے یہ آگ سب کچھ جلا کر رکھ ہی کر دے گی۔ میں نے اس سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ میں اپنوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن کیسے

فخر تھا، اور ہمیشہ رہے گا، لیکن وہ بہت نازک بہت معصوم سی لڑکی ہے۔ آپ اُس کے لیے دُعا ضرور کیجئے گا، کیونکہ میں جانتی ہوں کہ آپ کی دُعا میں رد نہیں ہوتی۔ جس دن سے وہ آپ سے مل کر گئی ہے، اس کی حالت بہت خراب ہے۔ دن رات بخار میں تپ رہی ہے۔ اس کی اماں کہتی ہیں کہ بارش میں بھگنے کی وجہ سے اسے سردی لگ گئی ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ اس جذبے کی شدت ہے جو آپ کی محبت نے اس کے دل میں جگایا ہے۔۔۔۔۔ پہلی مرتبہ۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ ایسے کسی بھی جذبے سے ہمیشہ انجان رہی ہے۔ میں آپ کو نہیں بتانا چاہتی تھی کیونکہ ایمان نے مجھے سختی سے منع کیا تھا۔ لیکن حیا کے کہنے پر آپ سے دُعا کی التجا کرتی ہوں۔ خدا کرے کہ میری ساری خوشیاں آپ کو اور آپ کے سارے غم خدا مجھے دے دے۔“

یہ بہنیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں وہ یہ نہیں جانتیں کہ ہم سب کو اپنے اپنے حصے کا عذاب کسی نہ کسی صورت بھگت کر ہی یہاں سے جانا ہے۔ میں نگہت کا خط پڑھ کر بے حد فکر مند ہو گیا۔ حیا مجھ سے دُعا کی اُمید کیے بیٹھی تھی۔ وہ بچی اتنا بھی نہیں سمجھتی تھی کہ اگر میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج ایمان میری نہ ہوتی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح سے میرے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر ایمان کے پاس جا پہنچوں۔

مجھے خود پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہی تو ہو رہا تھا۔ میں نے ہی اس نازک سی لڑکی کی رگوں میں عشق کا یہ نیلگوں زہر اتارا تھا اور لوگ مجھ سے ہی اس کے تریاق کی اُمید بھی کر رہے تھے۔ سچ ہے کہ محبت ایک نرم گلابی موسم کی طرح جسم پر اُترتی ہے لیکن رفتہ رفتہ یہی گلابی موسم ایک دہکتی آگ میں بدل جاتا ہے۔ آس پاس نیلی تتلیاں جھلس کر مر جاتی ہیں۔ سب پھول ساری پنکھڑیاں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔

اور پھر اس نازنین کے کول وجود کو جلانے کے لیے تو مذہب کی کڑی دھوپ ہی کافی تھی۔ ایک نامحرم سے بات کرنے کا احساسِ جرم ہی اس کو ساری زندگی تڑپانے کے لیے بہت تھا۔ ایسے میں اگر محبت کی آگ بھی اس تپش کو دو آتشہ کرنے کے لیے موجود ہو تو پھر اس

جیسے سردی بڑھتی جا رہی تھی، دھوپ کا سنہرا پن بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں پلیٹ فارم کے اس کونے پر جہاں سے سورج کو آخری وقت تک سہانے کے پہاڑ کے پیچھے ڈوبتا دیکھا جاسکتا تھا۔ بہت دیر سے بیٹھا اپنے وجود پر دھوپ کے اس سونے کو جذب کر رہا تھا۔ کہ شاکر مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ نکلا، جانے آج کل میں اپنے کسی بھی پُرانے رشتے کو دیکھ کر آج میں ڈر سا کیوں جاتا تھا۔ دسو سے دل میں گھر کرنے لگتے تھے۔ شاکر زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ وہ نگہت کا رقعہ مجھے دینے آیا تھا۔ میرے گھر والوں کے بارے میں اُس نے بتایا کہ امی اب مکمل طور پر ٹوٹ چکی ہیں۔ کسٹرن صاحب سے ان کی اس موضوع پر کئی مرتبہ بحث ہو چکی ہے۔ وہ سب یہ بھی جان گئے ہیں کہ میں کراچی یا اسلام آباد اپنے کسی دوست کی طرف نہیں ہوں، نہ میں لندن کا مران کے پاس گیا تھا بلکہ میں یہیں اسی شہر میں کہیں رہ رہا ہوں۔ شاید آتے جاتے کسی جاننے والے کی نظر مجھ پر پڑ گئی ہو۔ لیکن میرے گھر والے اس ریلوے اسٹیشن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے شہر کے فائیو اسٹار ہوٹل یا بڑے گیسٹ ہاؤسز میں ہی تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

شاکر اُٹھتے ہوئے بولا۔

”حماد بابا۔۔۔۔۔ آپ نے پورے گھر کو، اس پورے زمانے کو یہ یقین دلادیا ہے کہ آپ کے جذبے سے زیادہ بڑھ کر اس دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔ آپ نے زمانے کو اپنی ٹھوکر میں لا ڈالا ہے۔ اب میری صرف اتنی التجا ہے کہ اگر گھر والے آپ کو واپس بلانا چاہیں تو انکار مت کیجئے گا۔ نگہت آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ اس کی رخصتی بھی طے کر دی ہے اگلے مہینے۔ ہو سکے تو اس سے ملنے کے لیے ایک چکر لگا لیجئے گا۔ چلتا ہوں۔“

شاکر مجھے نگلے لگا کر وہاں سے چلا گیا۔ میں نے نگہت کا بھیجا ہوا لفافہ کھولا، لگتا تھا

نگہت نے بہت کرب کے عالم میں یہ خط لکھا تھا، ہر ہر لفظ سے درد ٹپک رہا تھا۔

”بھیا۔۔۔۔۔ میں جانتی تھی کہ آپ کے جذبوں کے سامنے کوئی نہیں

ٹک پائے گا، بہت طاقت ہے آپ کی محبت میں، آپ کے جنون

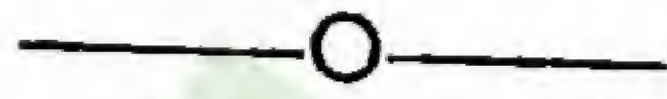
میں۔ آپ کی محبت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا، ایمان جیسی لڑکی نے

بھی آپ کے جذبے کے آگے سر جھکا ہی دیا، مجھے آپ پر ہمیشہ سے

ہم دونوں کو مذہب کی ان زنجیروں سے نکال کر محبت کے حوالے کر دیں۔ ہمارا فیصلہ مذہب کو نہیں، بلکہ محبت کر کرنے دیں۔

لیکن میں کس قدر بے بس تھا، سوائے ان خیالات کی یلغار کے، میرے پاس لڑنے کے لیے اور کوئی دوسرا میدان بھی تو نہیں بچا تھا۔ دن تھے کہ بیٹے جارہے تھے، ایمان کی رخصتی سر پر آ چکی تھی۔ بس دو دن ہی تو رہ گئے تھے میری سانسوں کو میری روح سے جدا ہونے میں۔ اگر ایمان مجھے مولوی صاحب کے سامنے گڑ گڑانے کی اجازت دے جاتی تو میں اسی مسجد کے سامنے خود کو سولی پر لٹکانے کے لیے بھی تیار تھا۔ کیا تب بھی ان کا دل موم نہ ہوتا۔۔۔؟

لیکن وہ ستم گر تو مجھے مزید باندھ کر چلی گئی تھی۔ اُس نے اپنے اُجلے دامن کی حرمت اور اپنے سفید پوش باپ کی مجبوریوں کا ذکر کر کے میرے جنون کو جیسے زنجیریں میں ہی تو جکڑ دیا تھا۔ ورنہ شاید میں اس کی بیماری کا سن کر باقاعدہ کشکول لے کر مولوی صاحب کے دروازے پر ہی جا بیٹھتا۔ اور تب تک ان کی چوکھٹ پر سر پٹختا رہتا جب تک وہ خود آ کر میرے لہو لہان سر کو تھام نہ لیتے۔۔۔۔۔ لیکن افسوس، میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔



وہ ایسی ہی اک اداس اکتوبر کی آخری شاموں میں سے ایک شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سُرخ میرے ارمانوں کے خون کی طرح بکھری ہوئی تھی، ہوا سرد تھی، خزاں نے پلیٹ فارم پر بھی ڈیرہ جمالیا تھا۔ شہوت کے پتے پہلے زرد اور پھر سُرخ ہو کر خشک ٹہنیوں سے کٹی پتنگوں کی طرح گر رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ پلیٹ فارم پر کسی نے زردی مائل سُرخ پتیوں کی کوئی چادری بچھا دی ہو۔ میں اسی چادر پر رکھے اپنے مخصوص بیچ پر لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل ایمان کے ہاتھوں میں عبد اللہ کے نام کی مہندی رچ جائے گی اور پرسوں اُسے گھر سے اس جاتی بہار کی طرح رخصت کر دیا جائے گا۔ نگہت نے مجھے بتایا تھا کہ شادی کے بعد مولوی صاحب نے انہیں مجھ اپنی بہن کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ عبد اللہ کے لیے وہاں کسی چھوٹے موٹے کام کا بندوبست بھی کر آئے تھے۔ مجھ میں کوئلے کی بہت سی کانیں بھی تھیں۔ انہی کانوں کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی آباد

کی تڑپ کا اندازہ میں خوب کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا وجود اسی مذہب اور محبت کی جنگ کے بیچ جھلس رہا تھا۔ مذہب اسے مولوی علیم کی طرف کھینچ رہا تھا اور محبت اُسے میری طرف دھکیل رہی تھی۔ اور اس کھینچا تانی میں وہ ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ اس کا نازک بدن کٹ رہا تھا۔ روح تقسیم ہو رہی تھی۔ میں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مذہب ایسی محبت کے خلاف کیوں ہے؟ اور اگر ایسی محبت جرم ہے تو جرم اپنے ساتھ احساسِ ندامت، خوف اور افسوس کی بجائے خوشی و مسرت کیوں لے کر آتا ہے؟ کیوں یہ جرم بار بار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر گناہ کے بعد انسان کو چند لمحے کے لیے ہی کیوں نہ سہی، پرتاسف ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ محبت کیسا گناہ ہے جو ہر روز گزرنے کے ساتھ ساتھ اور نیا اور حسین ہوتا جاتا ہے۔ یہ کیسا گناہ ہے جو دل کو مُردہ کرنے کی بجائے ہر لمحہ اس میں نئی روح پھونک رہا ہوتا ہے۔ تو پھر کیا نہیں سمجھ لوں کہ مذہب کا محبت کے بارے میں یہ کلیہ ہی ہمیشہ سے غلط تھا اور غلط ہے؟ مذہب اگر انسانوں سے، رشتوں سے، جانداروں سے، حتیٰ کہ پھول پودوں اور نباتات و جمادات سے بھی محبت کرنے کا درس دیتا ہے تو پھر اس محبت کو غلط کیوں کہتا ہے۔ کیوں ایسی محبت کو بھی گناہ سمجھتا ہے جس میں سوائے ایک دوسرے کو دیکھنے اور بات کرنے کے اور کوئی مادی چاہ نہ ہو۔ پاک محبت بھی گناہ کے زمرے میں کیوں آتی ہے۔ صرف اس اندیشے کی بنیاد پر کہ آگے چل کر مواقع ملنے پر اور تنہائی میں سر آنے پر یہ محبت بھی سفلی جذبات میں ڈھل جائے گی، اور اگر ایسا نہ ہو۔۔۔۔۔ اگر جسم کا حصول ہی اس محبت کی ترجیحات میں کبھی شامل بھی نہ رہا ہو تب کیا ایسی محبت مذہب کے لیے قابل قبول ہو جاتی ہوگی۔۔۔؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟

مذہب کو تو صرف محبت سے پیدا ہونے والے گناہ کے جذبے سے روکنا چاہیے۔ محبت سے نہیں۔ میں تو مذہب کے اس فلسفے کو سمجھنے سے ہی قاصر تھا۔ میں تو اسی محبت کے وسیلے سے مذہب کے قریب ہوا تھا۔ اور اب جب کہ یہی مذہب مجھے محبت کرنے سے روک رہا تھا تو میں خود بخود اس مذہب سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ بلکہ میں ایمان کی اس حالت کا ذمہ دار بھی براہِ راست اس مذہب کو ہی سمجھتا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مولوی علیم کے قدموں میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ ان کے پاؤں پکڑ لوں کہ ہمارے درمیان یہ مذہب کی دیوار کھڑی نہ کریں۔

”ہمارے گھر، زیادہ سوال نہ کیجئے گا، بس چلنے کی کریں۔“

اس وقت عبداللہ کی حالت ایسی تھی کہ میں واقعی کوئی دوسرا ہوا نہ کر سکا۔ عبداللہ پلٹا اور میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کے تمام لیمپ پوسٹ اور گیس کے ہنڈولے جل چکے تھے۔ لیکن اکتوبر کے آخری دنوں کی شدید دھند اور کھرنے والوں نے سارے ماحول کو اس طرح سے لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ وہ سب روشنیاں صرف ٹٹماتی بتیاں اور دھیمے چراغ دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے گہرے سفید بادلوں میں کسی نے بہت سے جگنو چھوڑ دیے ہوں۔

میں اور عبداللہ اسی کھرنے والے اور دھند کے بادل میں جیسے رستہ بناتے ہوئے اسٹیشن کی مرکزی عمارت سے باہر نکلے، باہر سڑک بھی سنسان اور دھند میں لپٹی پڑی تھی۔ جیسے کوئی سانولی بیوہ سفید ساڑھی لپیٹے ابھی ابھی نین کر کے لیٹی ہو، میں اور عبداللہ اس کھرنے والے مایوس سے کھڑے آس پاس کسی سواری کی تلاش میں نظریں دوڑاتے رہے۔ عبداللہ کی حالت بالکل ایسی تھی جیسی جل بن مچھلی کی ہوتی ہے۔ وہ بار بار بے چینی سے ہاتھ مل رہا تھا جیسے وقت اس کے ہاتھ سے پھسلا جا رہا ہو۔ جانے اُسے کس بات کی اتنی جلدی تھی۔ اتنے میں خیر و کسی رحمت کے فرشتے کی طرح کسی سواری کو چھوڑ کر واپس آتا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے اُسے آواز دی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے ہم خیر و کے سبک تانگے میں پڑانے محلے کی طرف روانہ تھے۔ لیکن رات کی شدید دھند اور کھرنے کی وجہ سے خیر و کا گھوڑا بھی جیسے پھونک پھونک کر فضا میں قدم رکھ رہا تھا۔ خیر و نے احتیاطاً تانگے کے اگلے بانسوں کے ساتھ لگے گیس کے دونوں ہنڈولوں کو بھی جلا دیا تھا تا کہ راستہ کچھ تو واضح نظر آئے لیکن اس سے بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے گھوڑے کے نتھنوں میں سے بار بار بھاپ کی شکل میں آتی جاتی سانس کا نشان مل رہا تھا۔ ہم اندھیری سڑکوں پر دُور دُور لگے لیمپ پوسٹوں کی کمزور پیلی روشنیوں کے دائرے سے ہوتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی ہمیں دور سے لٹن روڈ کے دورویہ گھنے درختوں کی قطاروں سے اس بجھی نما تانگے میں اس دھند اور کھرنے میں کہیں جاتے دیکھتا تو اُسے ضرور شرلاک ہو مزر کی فلموں کے ایسے بہت

تھیں جن میں ان کو نڈکانوں کے کان کن رہتے تھے۔ ایسی ہی کسی ایک بستی کی مسجد کی امامت کے لیے انہوں نے عبداللہ کا نام منظور کروا لیا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ مولوی علیم نے یہ قدم بھی صرف اور صرف میری وجہ سے ہی اٹھایا تھا۔ ورنہ وہ ایمان کی جدائی کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ نگہت نے تو یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ایمان کی رخصتی کے بعد مولوی صاحب بھی زیادہ عرصہ کوئٹہ میں نہیں ٹکیں گے اور اندر ہی اندر انہوں نے خود بھی بیوی اور حیا سمیت یہاں سے چھٹے منتقل ہونے کا پورا پروگرام بنا رکھا ہے۔ میرے ذہن میں پھر نفرت کے سانپ نے پھن پھیلائے۔ مذہب میری محبت کو قتل کرنے کے بعد اس کی میت بھی یہاں دفن نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اُسے بھی مجھ سے دُور لے جانا چاہتا ہے۔

پھر مجھے عبداللہ کا خیال آیا۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ، اُسے ایمان ملنے والی تھی۔ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں ان کی محبت مل جاتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت ایسے لوگوں کی، ان کے دل کی، کیسی حالت ہوتی ہوگی جب وہ اپنی محبت کے اتنے قریب ہوتے ہوں گے۔ ان کے دل خوشی سے پھٹ کیوں نہیں جاتے اس لمحے۔۔۔؟ میں اگر عبداللہ کی جگہ ہوتا تو یقیناً میں اس وصلِ محبت سے پہلے ہی خوشی سے مر جاتا۔

میری عبداللہ کے بارے میں سوچیں اس قدر طاقت ور ہو گئی تھیں کہ میں نے اُسے اپنے سامنے ہی پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے، اپنی طرف دور سے بڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے سر جھٹک کر اس خیالات کی رو سے نکلنے کی کوشش کی لیکن عبداللہ کا وہ ہیولا اب بھی میرے سامنے ہی بڑھا چلا آ رہا تھا میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو درحقیقت عبداللہ ہی تھا جو ان زرد اور سُرخ خشک پتوں کی چادر کو روندتے ہوئے چہرے پر بے انتہا پریشانی لیے میری جانب ہی بڑھا چلا آ رہا تھا۔ مجھ سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ دو قدم چل کر میں خود اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا۔ بس ساکت کھڑا اُسے اپنی طرف آتے دیکھتا رہا۔ عبداللہ میرے قریب آ گیا، اُس نے اپنی بکھری سانسوں کو سینے کی کوشش کیے بنا ہی براہِ راست مجھے کہا۔

”آپ کو ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

میں نے بوکھلا کر اُس کی طرف دیکھا۔

”ساتھ چلنا ہوگا لیکن کہاں۔“

تھا۔ اچانک آہٹ سن کر اندر سے نگہت برآمد ہوئی۔ میں اس وقت نگہت کو یہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ برآمدے کے چھوٹے چھوٹے سے طاقتوں میں رکھی شمعیں جھللا رہی تھیں جن کی ہلکی روشنی میں نگہت کی آنکھوں میں چھپے آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دھند کو چیرتی ہوئی تیزی سے میری طرف دوڑتی ہوئی آئی اور میرے سینے سے لگ کر سسکی پڑی۔ میں ابھی تک حیران و پریشان سا وہیں کھڑا تھا۔ عبداللہ نے میرا ہاتھ تھاما اور برآمدے میں اس حصے کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں زنانہ تھا۔ یہ کیا، عبداللہ مجھے گھر کے زنانے حصے کی طرف کیوں لے کر جا رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اگر مجھے اپنے گھر میں یوں آزادی سے چلتے پھرتے دیکھ لیا تو غضب ہی تو ہو جائے گا۔ لیکن عبداللہ مجھے بنا کچھ کہنے کا موقع دیے زبردستی کھینچتا ہوا اس کمرے میں لے گیا جو برآمدے کے سرے پر بنا ہوا تھا۔ نگہت بھی میری کہنی سے لپٹی میرے ساتھ ہی کمرے میں چلی آئی۔

کمرے کی ہلکی روشنی میں جس پہلے شخص کے چہرے پر میری نظر پڑی وہ خود مولوی علیم ہی تھے۔ میں ٹھنک کر رک گیا، مولوی علیم کے چہرے پر اک عجیب بے بسی تھی۔ ایسی بے بسی صرف اس شخص کے چہرے پر ہو سکتی ہے جو ایک لمبی جنگ کے بعد اس وقت ہار گیا ہو جب اسے اپنی جیت کا پورا یقین ہو چکا ہو۔ ان کے ساتھ ہی پیچھے حیا موجود تھی۔ اور ایک پرنور چہرے والی عورت چادر لپیٹے کمرے کے وسط میں پڑے پلنگ کی پانکتی سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ سب خاموش سے کیوں تھے؟ پھر میری نظر کمرے کے مجھے اندھیرے نما اُجالے سے جیسے ہی مانوس ہوئی تو مجھے لگا کہ پلنگ پر کوئی لیٹا ہوا ہے جس کے ماتھے پر شاید ٹھنڈی پٹیاں رکھنے کے لیے حیا اور اس کی اماں پلنگ کے دونوں اطراف کی پانکتی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی سلور کا بڑا سا تسلا پڑا تھا جس میں کچھ سفید پٹیاں تیر رہی تھیں۔ ایک دم سے میرے ذہن میں کوئی جھماکا سا ہوا۔ میں جیسے نیند کے عالم سے یک لخت جاگ گیا تھا۔ پلنگ پر کوئی اور نہیں ایمان ہی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے شدید نقاہت سی ٹپک رہی تھی لیکن چہرے کے گرد نور کا گلابی سا ہالہ اب بھی ویسے ہی قائم تھا۔ اس کی سانس رُک رُک کر چل رہی تھی اور وہ آنکھیں موندھے کسی سنود ہائٹ کی طرح کسی لمبی اور گہری نیند میں دکھائی دے رہی تھی۔

چند لمحوں کے لیے مولوی علیم کی مجھ سے نظریں ملیں اور پھر انہوں نے نظریں جھکا لیں۔

بالآخر تانگہ پُرانے محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوا، محلہ سنسان پڑا تھا، میں اور عبداللہ جلدی سے تانگے سے نیچے اترے۔ عبداللہ تیزی سے گھر کی طرف بڑھا۔ میں دفعتاً ٹھنک کر رک گیا، یہ میں کہاں آ گیا تھا، یہ گلی، یہ کوچہ، یہ گھر تو میرے لیے ممنوع تھا۔ میرے تو یہاں آنے پر پابندی لگادی گئی تھی۔ میں مولوی علیم کی تو کسی پابندی کا کبھی پابند نہیں رہا تھا، لیکن یہ پابندی تو میری زندگی، میری سانسوں کی اس مالک کی لگائی ہوئی تھی۔ جس کا اب میری ہر آتی جاتی سانس پر اختیار تھا۔

عبداللہ کو جب احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ قدم نہیں بڑھا رہا ہوں تو وہ فوراً پلٹا۔
”آپ رُک کیوں گئے، جلدی چلئے۔۔۔“

”میں۔۔۔۔ میں تمہارے اندر نہیں آ سکتا، مجھے ایمان نے منع کیا تھا۔“

میں نے نا سنجھی میں ایمان کا نام تو لے لیا لیکن پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میں جلد بازی میں ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے ایمان کا راز افشاں کر بیٹھا ہوں۔ میں نے گھبرا کر بات پلٹنے کی کوشش کی۔

”میرا مطلب ہے کہ مولوی صاحب۔۔۔۔ انہیں میرا یہاں آنا۔۔۔۔“ عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔
”انہیں شاید اب اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، آپ اندر آئیں، دقت زیادہ نہیں ہے۔“

میں پھر بھی اپنی جگہ جم رہا، میں ایمان سے کیا وعدہ نہیں توڑ سکتا تھا۔
”لیکن ایمان۔۔۔۔“

”میں ایمان ہی کے کہنے پر آپ کو اسٹیشن لینے کے لیے آیا تھا، آئیے۔۔۔۔ وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی ہے۔“

عبداللہ مجھے گم صم اور سکتے میں چھوڑ کر دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھانا پڑے۔ صحن کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ محلے کی بجلی گئی ہوئی تھی، ایمان کا گھر بھی دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ صحن کا جھولا ہوا کے زور سے یوں آہستہ آہستہ جھول رہا تھا جیسے ابھی ابھی ایمان یہاں سے اُٹھ کر گئی ہو۔ گھر پر ایک عجیب سا سکوت اور سناٹا طاری

عبداللہ مجھے یوں دروازے پر ہی سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھ کر آہستہ سے کھنکارا اور اس نے نگہت کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا۔ نگہت میرا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوگئی اور میں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ ہی آگے بڑھا آیا۔ عبداللہ ایمان کے پیروں کی جانب بیٹھ گیا اور اُس نے آہستہ سے کہا۔

”ایمان۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔۔۔ دیکھو شوم سے ملنے کون آیا ہے۔“

ایمان کی نیند یا بے ہوشی اب بھی نہیں ٹوٹی۔ حیا نے دھیرے سے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں، اور جانے اس کے کان میں آہستہ سے کیا کہا۔۔۔۔۔ ایمان کے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور اس نے رفتہ رفتہ اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔ وہی جان لیوا دود بڑی بڑی کالی آنکھیں۔۔۔۔۔ پھر اس کی نظریں مجھ سے ملیں۔۔۔۔۔ وہی روح کھینچ لینے والی نظر، وہ چند لمحے پلکیں جھپکائے بنا مجھے دیکھتی رہی۔ جیسے میری شبیہ کو اپنی آنکھوں کے پردے میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔ نقاہت اور بیماری نے اُس کے خُسن پر ذرا سا بھی فرق نہیں ڈالا تھا۔ بلکہ آج مجھے وہ تھکا تھکا سا حسن پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی اکھڑی اکھڑی سانسیں بتا رہی تھیں کہ محبت کا قاتل زہر اس کی رگوں میں پوری طرح پھیل چکا ہے۔ اُس محبت نے ایک جیتی جاتی، ہنستی کھلکھلاتی لڑکی کا کیا حال کر ڈالا تھا۔

یا خدا۔۔۔۔۔! یہ کیسا عجیب دن تھا، کیسی کیسی انہونیاں ہونے کو جا رہی تھیں۔ مولوی علیم کی موجودگی میں میں ان کی بیمار بیٹی کے کمرے میں موجود تھا۔ ان کا سارا گھر انہ بشمول ان کے ہونے والے داماد کے، سب ہی تو یہاں موجود تھے لیکن آج مولوی علیم کی زبان پر تالا پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیکے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں اتنا ارتعاش تھا کہ وہ ٹھیک سے تسبیح بھی نہیں پھیر رہے تھے۔ محبت بھی کیسے کیسے معجزے دکھاتی ہے، اس کا احساس مجھے اس دن مولوی علیم کی خاموشی دیکھ کر ہوا تھا۔

ایمان کے لب ذرا سے ہلے، لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ مولوی صاحب تڑپ کر آگے بڑھے اور ایمان کے ماتھے پر بوسہ دیا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ ان کی بیوی کی آنکھوں سے زار و قطار ٹپ ٹپ آنسوؤں کی جھڑی بہہ رہی تھی لیکن وہ اتنی خاموشی سے رو رہی تھیں کہ جب تک کوئی انہیں دیکھے نہ اسے پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ میری نظریں بس ایمان پر ہی جمی ہوئی

تھیں۔ اور پھر ایک اور معجزہ ہوا، مولوی علیم آگے بڑھے اور میرا ہاتھ خود ہی تھام کر مجھے ایمان کے سر ہانے تک لے آئے۔ حیا نے اُٹھ کر میرے کھڑے ہونے کی جگہ خالی کر دی۔ ایمان نے ایک لمحہ مجھے دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر وہی ہلکی سی کائنات کو زندگی بخش دینے والی جانفزا سی مسکراہٹ ابھری جو اس کے گالوں میں ہلکے سے گڑھے ڈال دیتی تھی۔ اس کی نظر نے ایک لمحے میں ہی میری نظر سے مل کر ساری کائنات کو تسخیر کر لیا، کہ جیسے کہہ رہی ہو کہ ”محبت فاتح عالم“ اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں کچھ دیر تک اُسے ساکت دیکھتا رہا کہ کب وہ دوبارہ آنکھیں کھولے اور کہیں مجھ سے اس کی کوئی نظر چوک نہ جائے۔ لیکن اس نازنین کی نیند لمبی ہوتی گئی اور پھر مجھے کہیں ذور خلا میں سے مولوی علیم کی آواز آتی سنائی دی۔

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“

کیا۔۔۔۔۔؟ کیا آس پاس کسی کی موت ہوگئی ہے جو مولوی صاحب اس وقت بے موقع یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ انہیں یوں سکون سے سوئی ہوئی اس شہزادی کے سر ہانے ایسا کچھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ بدشگون بھی تو ہو سکتی ہے نا۔ میں نے غصے اور ناگوار سے مولوی صاحب کی طرف دیکھا، لیکن وہاں تو حیا اور نگہت بھی ایک دوسرے سے لپٹی سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ اب انہیں کیا ہو گیا ہے، میں نے عبداللہ سے مدد لینے کے لیے اس کی طرف دیکھا کہ اس سے کہوں کہ ان دو بے وقوف لڑکیوں کو ایمان کے سر ہانے سے دُور لے جائے۔ ابھی تو وہ نازنین تھک کر ذرا سوئی ہے۔ جانے کب کی جاگی ہوئی تھی۔ اب ان دونوں کا یہ بین ہی کہیں اس کو نہ جگا دے۔۔۔۔۔ لیکن یہ کیا، عبداللہ تو خود گھٹنوں میں منہ چھپائے ہڑک ہڑک کر رو رہا تھا۔ یہی حال ایمان کی اماں کا بھی تھا۔ حیا اور نگہت بجائے اماں کو چپ کر ڈانے کے خود بھی ان کے ساتھ مل کر رو رہی تھیں۔ اماں حیا اور نگہت بار بار بڑھ کر اس کی روشن جبیں کو چوم رہی تھیں۔ اس کی زلفیں سنوار رہی تھیں۔ جانے انہیں اتنا سا بھی احساس کیوں نہیں ہو رہا تھا کہ کسی کی نیند میں یوں خلل نہیں ڈالا کرتے۔ مولوی صاحب اب بھی زور زور سے کچھ آیتیں پڑھ رہے تھے، میں آخری اُمید کے طور پر ان کی جانب مڑا کہ شاید وہ ہی ان نادانوں کو کچھ سمجھا پائیں لیکن یہ کیا خود مولوی صاحب کا چہرہ اور داڑھی بہتے آنسوؤں سے تر تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو چہرے سے صاف کیے اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو

کے لیے بولے جاتے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ آسمان کیوں نہیں پھٹ پڑا، زمیں کی گردش ساکت کیوں نہیں ہو گئی۔ ہم سب جو اس مہ جہیں سے اس قدر محبت کے دعوے دار تھے۔ ہم سب کی سانسیں بھی اسی لمحہ کیوں نہ تھم گئیں جب اس اکھڑتی سانس کا زیرو ہم تھا تھا۔ میری آنکھیں تو اس سے پہلی ملاقات کے بعد اُسی کی آنکھوں سے دیکھتی تھیں۔ پھر اب تک ان میں روشنی کیوں تھی؟ میرے لب تو اسی کے لفظ بولتے تھے، پھر اب تک میرے بولنے کی قوت کیوں نہیں چھین لی گئی تھی؟۔۔۔۔۔ میرے کانوں کو تو صرف اُسی کی آہٹوں اور شہد جیسی میٹھی بولی کا انتظار رہتا تھا۔ پھر میری سماعتیں اسی لمحہ ناکارہ کیوں نہیں ہو گئیں، میرا دل جو اس کے نازک دل کے ساتھ دھڑکنے کا دعوے دار تھا، وہ اس کے دل کی دھڑکنے کے ساتھ ہی پھٹ کیوں نہیں گیا۔ میں تو اس کے سائے کو بھی کسی کو دینے کا روادار نہ تھا، پھر کوئی میرے سامنے اس کے کول وجود سے روح کیسے چھین لے گیا۔

یعنی میرے سارے دعوے ہی جھوٹے نکلے، میرے اندر سے چیخوں کا ایک طوفان اُبل اُبل کر باہر آنے کے لیے تیار تھا لیکن میری مجبوری تو دیکھئے کہ اس ماہِ رخ کی حرمت کا خیال مجھے کھل کر ماتم کرنے سے بھی روک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے آنسو بھی خشک ہونے لگے اور اس دن مجھے بنا آنسوؤں کے رونے کا مطلب بھی سمجھ آ گیا۔ مولوی صاحب نے میری ہچکیوں کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے کچھ ہی دیر میں اپنے حواس کا دامن چھوڑنا ہی پڑا۔ بے سدھ ہونے سے پہلے میں نے آخری مرتبہ ایمان کی اماں کو اس کا ماتھا چومتے اور چہرے پر چادر ڈالتے دیکھا اور پھر مجھے آس پاس کا کچھ ہوش نہیں رہا، میں وہیں مولوی صاحب کے گلے لگے لگے ہی ان کی بانہوں میں جھول گیا۔

OO

اُس دن کے بعد شاید جب پہلی مرتبہ میں اپنے حواس میں واپس آیا تو پندرہ دن کا وقفہ بیت چکا تھا۔ میں صدیقی صاحب کے گھر میں ہی اُسی کمرے میں ڈرپس اور بازوؤں میں گھبے کی نولاز اور سرنجوں سے لدا پھندا اسی بستر پر پڑا تھا۔ بعد میں صدیقی صاحب نے بتایا کہ ریلوے کے ہسپتال میں چھ دن رکھنے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے گھر ہی منتقل کر دیا تھا

چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ نگہت اور حیا کو گھورا اور ویسے ہی ہونٹوں پر انگلی رکھے انہیں بھی خاموش رہنے کا حکم دیا لیکن میرے اس حکم کا انہوں نے الٹا ہی مطلب لیا۔ حیا کی تو ہچکیاں ہی بندھ گئیں روتے روتے اور اس کی اماں کو اس کا وجود سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ نگہت تڑپ کر اٹھی اور میرے پاس آ کر اس نے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”بھیا۔۔۔۔۔ ایمان ہم سے روٹھ گئی ہے، وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔“

میرے دماغ پر جمی دھند اور برف جیسے پکھلنے سی لگی۔ یہ نگہت کیا کہنا چاہ رہی ہے! یہ سب اذک کیوں رورہے ہیں۔ دفعتاً میرے دماغ میں مولوی صاحب کی پڑھی ہوئی آیتوں کی گونج نا باز گشت کی طرح نکرائی۔ میں ایمان کے سر ہانے کی پابندی پر جھک کر بیٹھ گیا۔ وہ برف کی شہزادی۔ وہ بادقار حسن، وہ نور کا ہالہ اک چادر میں لپٹا پڑا تھا۔ آنکھیں موندھے اس کی سانس تھم چکی تھی۔ ہونٹوں پر اب بھی اک ہلکی سی مسکراہٹ تھی جسے صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا کیونکہ اُس کی وہ آخری مسکراہٹ صرف میرے لیے ہی تو تھی۔

میں نے اُسے دھیرے سے آواز دی۔

”ایمان۔۔۔۔۔“

لیکن وہ ساکت ہی رہی، میں نے گھبرا کر پیچھے کھڑے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ ”یہ بول کیوں نہیں رہی مولوی صاحب، اس سے کہیں کہ کوئی تو بات کرے۔ آپ کا کہنا یہ کبھی نہیں ٹال سکتی۔ آپ کہیں گے تو ضرور جواب دے گی۔ بہت محبت کرتی ہے یہ آپ سے۔ بڑا احترام ہے آپ کے لیے اس کے دل میں۔“

مولوی صاحب مجھے جواب کیا دیتے البتہ خود پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے اور مجھے کھینچ کر انہوں نے اپنے گلے لگا لیا۔ ان کے گلے لگتے ہی جانے آنسوؤں کا وہ کون سا سیلاب تھا جو میری آنکھوں سے اُٹ پڑا تھا۔ جتنا وہ مجھے تھکتے جاتے اتنا ہی میری ہچکیاں بندھتی جاتیں۔ دھیرے دھیرے میرے ذہن میں یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ ایمان کی سانس کیوں ساکت ہو گئی تھی، اور وہ ہم سب کی التجاؤں کا جواب کیوں نہیں دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں اب بھی اس کی ابدی خاموشی کے لیے وہ لفظ نہیں آ رہے تھے جو کسی ایسے شخص کی کیفیت

ساتھ بے حد احتیاط کی تلقین بھی کی تھی۔

شاید وہ بڑے ہسپتال میں میری آخری شام تھی کیونکہ اگلے دن مجھے صدیقی صاحب واپس اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے والے تھے۔ کہ اچانک ہسپتال کی راہداریوں میں ہڑبونگی سی مچ گئی۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس وہیل چیئر پر بیٹھا خالی نظروں سے باہر کا منظر تک رہا تھا۔ وہیں سے میں نے چند لمحے پہلے دو بڑی مرسلہ یز گاڑیاں ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوتی بھی دیکھی تھیں۔ کچھ دیر میں ہی راہداری کا وہ سارا شور میرے دروازے کے قریب آ کر ختم گیا۔ دروازہ کھلا اور اس میں سب سے پہلے ایک مانوس سی عورت کا چہرہ اندر آتے ہوئے نظر آیا۔ وہ عورت چند لمحے تو سکتے میں گنگ سی کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور پھر پتہ نہیں اُسے کیا ہوا، وہ روتے ہوئے دوڑ کر آئی اور میرے گلے لگ گئی۔ اس عورت کے پیچھے ہی ایک کچی عمر کا باوقار سا مرد جس نے بہترین سوٹ پہنا ہوا تھا اور دو اور لڑکے بھی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے چھوٹا لڑکا جو عمر میں مجھ سے ایک دو سال ہی کم ہوگا اس عورت کی طرح رونے لگا اور کبھی میرے چہرے اور کبھی میرے بالوں کو چھونے لگا۔ مجھے بڑی الجھن محسوس ہوئی۔ پھر نہ جانے ڈاکٹر نے اندر آ کر اس عورت سے کیا سرگوشی کی اور اس باوقار مرد سے کیا کہا کہ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور اس عورت کو پکڑ کر کھڑا کر دیا اور اُسے چُپ رہنے کو کہا۔ وہ سب لوگ رات دیر تک میرے ہی کمرے میں موجود رہے۔ پھر مجھے نیند آنے لگی تو نرس نے ہیلپر کی مدد سے مجھے بستر تک پہنچا دیا۔ سونے سے پہلے ایک عجیب سی بات ہوئی، اس باوقار مرد نے آگے بڑھ کر میرے گال پر زور سے تھپکی دی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے بہت پہلے بچپن میں بھی جب میں سونے لگتا تھا تو کوئی جاتے جاتے میرے گال کو اسی طرح تھپک کر جاتا تھا۔

اگلے دن سو کر اٹھا تو میرے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ وہ سب لوگ جو کل میرے کمرے میں گھس آئے تھے وہ بھی وہیں موجود تھے لیکن وہ عورت اور وہ مرد ڈاکٹر سے نہ جانے کس بات پر بحث کر رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر شاید انہیں کچھ اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد تھے لیکن ڈاکٹر انہیں کہہ رہا تھا کہ بہتر ہے کہ مجھے مکمل ٹھیک ہونے تک صدیقی صاحب کے ساتھ ہی جانے دیا جائے۔ اور سچی بات تو یہی

کیونکہ ریلوے ہسپتال میں اتنی سہولیات بھی نہیں تھیں اور شہر کے جس پرائیویٹ ڈاکٹر کو انہوں نے میرے علاج کے لیے طلب کیا تھا اس کا اور اس کی پوری ٹیم کا ریلوے ہسپتال میں روز آنا جانا ممکن نہ تھا۔ پہلے چند دن تو میری یادداشت نے ہی میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں حیرت سے ان اجنبی چہروں اور لوگوں کو دیکھتا رہا جو میرے آس پاس آتے جاتے، ٹہلتے، مجھے انجیکشن وغیرہ لگاتے اور میرا بخار چیک کرتے رہتے۔

صدیقی صاحب بتا رہے تھے کہ پھر مجبوراً ڈاکٹرز نے فیصلہ کر ہی لیا کہ مجھے شہر کے بڑے ہسپتال میں منتقل کر دیا جائے کیونکہ بظاہر تو میری حالت ٹھیک ہو رہی تھی لیکن میرے ذہن کا اور میری یادداشت کا میرے جسم کا ساتھ نہ دینا انہیں بہت پریشان کر رہا تھا۔ میں بڑے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ دن گزرتے گئے اب میری جسمانی حالت دھیرے دھیرے سُدھرنے لگی تھی۔ بخار کا وقفہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی نرس اگر دلیہ وغیرہ میرے حلق سے اُتارنے میں ناکام ہو بھی جاتی تو صدیقی صاحب آ کر ضد سے اور پیار سے مجھے کچھ مائع غذا کھلا جاتے۔ شاید اس دماغی بے ہوشی کے عالم میں بھی میں صدیقی صاحب کے احسانوں کی کیفیت تلے دبا ہوا تھا۔ اب دھیرے دھیرے مجھے ایک وہیل چیئر پر شام کے وقت ہسپتال کے بڑے سے دالان میں ایک طرف کو بنی چھوٹی سی جھیل تک یا گھاس کے میدان میں ٹھلانے کے لیے بھی لیجا یا جانے لگا۔

لیکن میرے دماغ پر جی دھند کسی طور پر کم نہیں ہو پا رہی تھی۔ شاید یہ میرے ہوش و حواس کی آخری رات کی وہ دھند تھی جو میرے ذہن سے لپٹ کر رہی رہ گئی تھی۔ میں چہروں کو دیکھتا اور انہیں پہچاننے کی کوشش بھی کرتا، لیکن سب ایک خواب کے عالم میں ہو رہا تھا۔ شاید ان دنوں میں مولوی علیم، عبداللہ، شاکر، خیر و، غفور اور جانے کون کون مجھ سے ملنے اور مجھے وہاں دیکھنے آتا ہوگا لیکن میں اُن مانوس چہروں کو بھی اجنبیت سے دیکھتا رہا ہوں گا۔

ڈاکٹروں کی رائے میں میرا دماغ اُن کی دی ہوئی ادویات کی تعمیل نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ میرے جسم نے ان کے علاج کی ہر ممکن تعمیل کی تھی۔ اب ڈاکٹروں کے بقول مجھے مزید ہسپتال میں رہنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے صدیقی صاحب کی درخواست پر مجھے ان کے ساتھ واپس گھر جانے کی اجازت تو دے دی تھی لیکن ساتھ ہی

وہاں آئی ہوئی تھی۔ اور یہ صدیقی صاحب۔۔۔۔۔ پھر اچانک مجھے اس کالی رات سے لے کر اب تک کا ہر واقعہ ہر چہرہ صاف نظر آتا گیا۔ ہسپتال میں کوئی اور نہیں بلکہ شاکر کے ساتھ کمشنر صاحب امی اور باقی گھر والے آئے تھے۔ ایمان چلی گئی تھی اور کتنے افسوس اور شرم کی بات تھی کہ میں اب تک زندہ تھا۔ میرے سر میں شدید درد سا اٹھا۔ ڈاکٹرز نے بعد میں مجھے بتایا کہ میں شدید صدمے سے اسی رات عارضی طور پر اپنا دماغی کنٹرول کھو بیٹھا تھا۔ میڈیکل کی زبان میں اسے شاید نپیری ایمنیز یا کہتے تھے۔ ایسے واقعات میں آج تک سینما کے پردے پر دیکھتا رہا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی بھی ایک ایسے دور سے گزرنے والی تھی۔ آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ کمشنر صاحب اور امی نے صدیقی صاحب کے گھر کے بہت چکر لگائے تاکہ میں ان کے ساتھ گھر چلا جاؤں۔ صدیقی صاحب بھی ان کے حامی تھے لیکن جس دن میں نے ان کو یہ کہہ دیا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے بھی کہیں اور چلا جاؤں تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔ اس دن کے بعد انہوں نے مجھ سے گھر جانے کا کبھی نہیں کہا۔ کمشنر صاحب اور امی، بھابھی، سجاد بھائی سب اپنے کیے پر بے حد شرمندہ تھے۔ لیکن اب مجھے ان لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ جس کے لیے میں جی رہا تھا جب وہ ہی نہیں رہی تو آگے کی زندگی کے ماہ و سال کہاں اور کس حال میں گزرنے لگے۔ اس سے مجھے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ عباد اللہ روز شام کو مجھ سے اسٹیشن پر آکر مل جاتا تھا۔ اب سب ہی یہ جان چکے تھے کہ میں ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا کا بیٹا اور ایک رئیس زادہ ہوں۔ لیکن میرے دوست اب بھی وہیں پرانے لوگ تھے۔ خیر و اور غفور اب بھی میرا اسی طرح خیال رکھتے تھے۔ لیکن ہوش و حواس واپس ملنے کے بعد بھی میرے لفظ مجھے واپس نہیں مل سکے۔ میرا بولنا چالنا بالکل ہی ختم ہو چکا تھا۔ میں گھنٹوں ایک ہی جگہ بنا کسی سے کوئی بات کیے چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی ہاتھ سے پکڑ کر کہیں زبردستی لے جاتا تو چل پڑتا اور نہ وہیں بیٹھا خلا میں تکتا رہتا۔ میں اب تک ذہنی طور پر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پایا تھا کہ ایمان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مجھے اس ساری دنیا سے ہی بے زاری محسوس ہوتی تھی جس میں میں خواہ مخواہ ہی جیے جا رہا تھا۔ مجھے اس مذہب سے جڑ ہو گئی تھی جس نے مجھ سے میری ایمان کو چھین لیا تھا۔ وہ معصوم لڑکی مذہب اور محبت کے درمیان کی اس جنگ میں پس گئی تھی۔ اس کا نازک

ہے کہ میں ان لوگوں کے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جانے کیوں ان سب کو دیکھتے ہی دماغ پر اک عجیب سا بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ پھر جیسے مرد اور عورت کو ڈاکٹر کی بات سمجھ میں آگئی کیونکہ انہوں نے شاید میرے چہرے پر اپنے لیے ناگواری کی لہر دیکھ لی تھی۔ میں صدیقی صاحب کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سب لوگ اور گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ ہی وہاں تک آئیں۔ پھر تو یہ روز کا معمول ہی بن گیا۔ وہ سب لوگ روز ہی صدیقی صاحب کے گھر چلے آتے جہاں میں برآمدے یا صحن والے باغیچے میں وہیل چیئر پر بیٹھا کسی پھول کسی دیوار کو تک رہا ہوتا۔

پھر ایک دن ایک عجیب سی بات ہوئی۔ ایک شخص جو ڈرائیور کی وردی میں ملبوس تھا ایک جوان لڑکی کے ساتھ صدیقی صاحب کے گھر آیا۔ دونوں ہی جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ لڑکی تو نہ جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔ پھر اس وردی والے ڈرائیور اور صدیقی صاحب نے اُسے بمشکل چپ کر دیا۔ پھر اس لڑکی نے صدیقی صاحب سے میرے کپڑوں اور دیگر چیزوں کے بارے میں پوچھا۔ صدیقی صاحب جانے کہاں سے ایک آدھ ہش شرٹ اور قلیوں کی وردی اٹھا لائے۔ وہ لڑکی تیزی سے اس شرٹ اور وردی کے جیب ٹٹولنے لگی۔ پھر جانے ان کپڑوں کی کس جیب سے دو موتی نکل کر برآمدے کے فرش پر گرے، تب میں اسی لڑکی کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ہی وہ دو موتی کپڑوں سے نکل کر فرش پر اُچھلے تھے۔ میرے ہاتھ بے اختیاری میں ان موتیوں کو سنبھالنے کے لیے اٹھ گئے جیسے میری کوئی بہت ہی قیمتی اور انمول چیز زمین پر گرنے جا رہی ہو۔ پھر جانے کیا ہوا، ان موتیوں کے گرنے کی آواز کا ارتعاش جیسے ہی میرے کانوں سے نکرایا۔ میرے اندر نہ جانے کتنا کچھ جھنجھٹا سا گیا۔ موتی گرنے کے بعد دوبارہ اُچھلے اور پھر زمین سے ٹکرائے میرے اندر پھر ایک جھنکار سی پیدا ہوئی۔ دُور بیٹھے مجھے یہ سب کچھ ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی فلم کو سلوموشن میں چلا دیا جائے۔ تیسری بار موتی زمین پر ٹکرانے سے پہلے ہی میرے ذہن میں ایک دم جھماکے سے ہونے لگے۔ میرے ذہن پر جمی برف پگھلنے لگی۔ یہ موتی تو مجھے ایمان نے دیے تھے۔ ہاں ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو وہی دو موتی تھے، لیکن یہ یہاں۔۔۔۔۔ اور یہ لڑکی۔۔۔۔۔ یہ تو مجھتھی جو وردی میں ملبوس شاکر کے ساتھ

دل اور سیدھا سادھا دماغ اس جنگ کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پایا اور اُس نے اپنی زندگی ہار دی۔ محبت، مذہب کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ محبت مذہب پر قربان ہو گئی تھی۔

درمیان میں ایک آدھ مرتبہ عبد اللہ بھی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ بس ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہتے اور پھر وہ الوداع کہہ کر چل دیتا۔ اس کا غم، میرے دکھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ہم لفظوں کی بولی سے زیادہ آپس میں خاموشی کی زبان زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی یہ لفظ بھی احساسات اور جذبوں کو کس قدر بے توقیر کر دیتے ہیں۔ ان کی عزت اور وقار کم کر دیتے ہیں۔ ان کی شدت کو بیان نہیں کر پاتے۔ سچ مانے تو لفظ کبھی کبھی ہمارے محسوسات اور جذبوں کو بے عزت کر دیتے ہیں شاید اسی لیے میں اور عبد اللہ آپس میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ بس خاموش رہ کر ایک دوسرے کا کرب محسوس کرتے تھے۔

واپس ہوش میں آنے کے بعد جب پہلی مرتبہ نگہت سے ملاقات ہوئی تو اُس نے مولوی علیم کی اس کایا پلٹ کے بارے میں بتایا تب مجھے پتہ چلا کہ ایمان اس آخری رات سے دو راتیں پہلے ہی اس جان کنی کے عالم میں تھی، ایسا لگتا تھا کہ اس کی روح نکلنے کے لیے بے چین ہے لیکن کسی کے انتظار میں نکل نہیں پاتی۔ ڈاکٹروں نے تو تین دن پہلے ہی جواب دے دیا تھا۔ مولوی صاحب کو اپنی دعاؤں پر دعاؤں سے زیادہ بھروسہ تھا لیکن تیسرے دن وہ بھی ٹوٹ گئے۔ عبد اللہ نے ان کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا کہ آخری بار وہ ان سب کی بات مان لیں۔ حیا جانتی تھی کہ ایمان کو کس کا انتظار ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایمان ساری عمر بھی چاہے ایسے ہی کیوں نہ تڑپتی رہے لیکن اس کے اندر کی ایمان اسے کبھی لب نہیں کھولنے دے گی۔ حیا نے بھی عبد اللہ کو مجھے بلوانے کے لیے کہا تھا۔ عبد اللہ نے حیا سے اس بارے میں دوسرا کوئی سوال ہی نہیں کیا اور براہ راست مولوی صاحب کی عدالت میں عرضی لگا دی تھی۔ مولوی صاحب پہلی رات تو بہت جزبہ ہوئے اور انہوں نے عبد اللہ کو سخت سُست بھی سنا دی تھیں۔ لیکن پھر دوسری رات اور پھر آخری رات جیسے جیسے ایمان کی حالت بگڑتی گئی اُن کے اندر کا سخت گیر مذہبی باپ ٹوٹا گیا حتیٰ کہ تیسری شام جب عبد اللہ ان کے سامنے رو

نہ صرف دہلیز بلکہ زنانے کی حد عبور کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ شاید وہ اسی لمحہ اندر سے ٹوٹ گئے تھے جب انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ ایمان بھی میری محبت میں اتنی ہی مبتلا تھی جتنا میں۔۔۔۔ شاید اُن کے لیے یہ تصور ہی محال تھا کہ ایمان صرف ان کی تابعداری میں اس رشتے کے لیے رضا مند ہوئی ہے۔ وہ اپنے تصور کی آخری حد تک جا کر بھی یہ گمان نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی کے دل میں یوں چور دروازے سے کوئی اندر بھی داخل ہو سکتا ہے۔ ان کے اندر کے مذہبی انسان کے لیے یہ بہت بڑا تازیانہ تھا۔ دوسری طرف ان کے اندر بے ایک پیار کرنے والے باپ کے لیے یہ بہت اذیت ناک تھا کہ ان کی جان سے پیاری بیٹی نے اپنی زندگی ان کی خوشی کے لیے قربان کر دی لیکن انہیں اپنے دل کی حالت کے بارے میں احساس تک نہیں ہونے دیا۔ شاید اس رات عبد اللہ کو مجھے بلالانے کی اجازت دینے والا شخص مولوی علیم الدین نہیں بلکہ صرف ایک باپ ہی تھا۔ لیکن اس باپ نے بہت دیر کر دی تھی، جب تک اُسے ہوش آیا وہ اپنی بیٹی کھو چکا تھا۔

مجھے نگہت نے ایک بند لفاظہ بھی دیا تھا جسے میں روزانہ کھولنے کی ہمت کرتا اور روز ہی ہار کر واپس سنبھال کر رکھ دیتا تھا۔ نگہت نے بتایا تھا کہ یہ لفاظہ ایمان نے اُسے اپنی بیماری کے دوران دیا تھا کہ اُس کی شادی کے بعد نگہت وہ لفاظہ مجھ تک پہنچا دے اس نازنین کو کیا خبر تھی کہ قدرت نے اس کی سانسیں ہی گن رکھی ہیں۔

پتہ نہیں میں ایمان کے اس آخری خط کو کھولنے سے اس قدر کیوں ہچکچاتا تھا۔ میں ایک مقدس تحریر کی طرح اس بند لفاظہ کو روزانہ اٹھاتا، چومتا، آنکھوں اور ماتھے سے لگاتا اور پھر واپس اسی دراز میں رکھ دیتا جہاں سے میں نے اُسے اٹھایا تھا۔ شاید میں اپنے اندر اس احساس کو جاوداں رکھنا چاہتا تھا کہ ایمان اب بھی اپنی اُس ان پڑھی تحریر کی صورت میں میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اُس کی ان کہی باتوں کو اپنے صبح و شام کے تحیر کی صورت میں زندگی گزارنے کا ایک بہانہ بنانا چاہتا تھا۔

لیکن پھر ایک دن مجھے اس عذاب سے بھی گزرنا پڑا۔ رحیم کو صدیقی صاحب نے جانے کون سا کاغذ لانے کے لیے دفتر سے دن کے وقت فون کیا۔ وہ گھر پر کھانا بنا رہا تھا۔ وہ

ہے۔ زندگی اس کی یاد کے سہارے آرام سے کاٹی جاسکتی ہے۔ میں آپ سے یہاں نہیں مل پائی تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ اس ابدی زندگی میں ساتھ رہنے کی دعا تو سدا میرے ساتھ رہے گی نا۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں آپ کو واپسی کے لیے بہت سے بھرم توڑنا پڑیں گے اپنے اندر کے آئینے سے لڑنا بھی پڑے گا۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

اپنا بہت خیال رکھیے گا اور ہمیشہ خوش رہیے گا۔“

OO

جانے میں نے اس عشوہ طراز کا یہ خط کتنی بار پڑھا اور جانے میں کتنی دیر سے ہچکیاں لے لے کر روتا رہا۔ پھر کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا، وہ عبد اللہ تھا۔ پتہ نہیں کب سے وہ یہاں کھڑا تھا۔ عبد اللہ نے میرے گالوں پر ہنسے آنسو پونچھ کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

”کب تک آپ ہم سب کو زلاتے رہیں گے۔ دیکھیں۔۔۔۔۔ آج آپ سے ملنے کون کون آیا ہے۔“

میں نے حیرت سے عبد اللہ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ لگتا تھا پلیٹ فارم میرے اور شا کر کے گھر والوں سے ہی بھرا ہوا تھا۔ امی، سجاد بھائی، عبیرینہ، بھابھی، عباد، سنی، شا کر اور مجھت کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی کشن صاحب اور ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سب سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار آنے میں بہت وقت لگا۔ مولوی علیم الدین آنکھوں میں آنسو لیے، سب سے آگے کشن صاحب کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔ شہر کا سب سے دہنگ ریٹائرڈ کشن ایک غریب مولوی کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی سدا کی مغرور آنکھوں میں نفرت کے بجائے شرمندگی تھی اور اس کی ہمیشہ سے اکڑی ہوئی کمر جھکی ہوئی تھی۔ وہ سب وہیں کھڑے رہے، بس مولوی صاحب میری طرف بڑھے میری

دیا۔ صدیقی صاحب بھی جانے کس دھن میں تھے کہ لفافہ کھول بیٹھے اور پھر کاغذ پر نظر پڑتے ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں اس وقت پلیٹ فارم کے ایک سنان گوشے میں بیٹھا دو مزدوروں کو مال گاڑی سے سامان اتارتے دیکھ رہا تھا۔ نظر بھٹکی تو صدیقی صاحب کو اپنے سامنے کھڑا پایا، میں سٹپٹا کر کھڑا ہو گیا۔

”معافی چاہتا ہوں میاں۔۔۔۔۔ رحیم کو کوئی کاغذ گھر سے لانے کے لیے کہا تھا۔ وہ جلدی میں تمہاری کوئی ذاتی تحریر اٹھا لایا۔ اور میں بھی بے خیالی میں اُسے کھول بیٹھا، لیکن اطمینان رکھو، اس تحریر کے سارے لفظ ویسے ہی ان چھوئے ہیں جیسے بند لفافے میں تھے۔“

صدیقی صاحب ایمان کا خط کھلے لفافے کی صورت میں میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں تھا کر واپس چلے گئے۔ میری حالت ایک لمحے میں کسی برسوں کے بیمار جیسی ہو گئی تھی۔ ناگلوں میں سے جیسے کسی نے ایک لخت ہی جان نکال دی ہو۔ گھبرا کر وہیں بیٹھ گیا۔ دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے میری نظروں کے سامنے ایمان کا خط نہیں بلکہ وہ خود موجود ہو۔ کتنے دن سے یہ خط میرے پاس بند پڑا ہوا تھا لیکن اُسے کھول کر پڑھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی، اور آج جب صدیقی صاحب نے غلطی سے اُسے کھول لیا تھا تو میرا دل اُسے پڑھنے کے لیے بے تابی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ایمان سے بات کرتے ہوئے اس دل میں اتھل پھتل ہوتی تھی، بالکل وہی کیفیت تھی اس وقت میری۔ آخر کار میں نے کانپتی انگلیوں سے خط کی تہیں کھول ہی دیں۔ اس گل رُخ کی وہی دل میں سیدھی اُتر جانے والی تحریر میری نظروں کے سامنے تھی اور آنسو خود بخود میری آنکھوں سے رواں ہو گئے۔

”میں جانتی ہوں آپ ابھی تک گھر واپس نہیں گئے ہوں گے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا۔۔۔۔۔ محبت میں ضد نہیں ہوتی۔ محبت تو ہتھیار ڈال دینے کا نام ہے۔ جیت کر بھی ہتھیار ڈال دینا صرف محبت کرنے والوں کا ہی تو شیوہ ہے۔ آپ بھی جیت چکے ہیں حماد۔۔۔۔۔ بس اب میری خاطر ہتھیار ڈال دیں۔۔۔۔۔“

اور پھر محبت صرف پالینے کا ہی تو نام نہیں ہوتا۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ زندہ رہنے کے لیے کبھی کبھی بس ایک ملاقات ہی کافی ہوتی

نظریں خود بخود جھک گئیں، وہ قریب آ گئے اور میرے شانوں پر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

”تم جیت گئے ہو حماد میاں، تمہاری محبت جیت گئی ہے۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ محبت سچی ہو تو وہ سارے زمانے کو اپنے آگے جھکا سکتی ہے۔ ہم سب اندر سے ٹوٹ چکے ہیں۔ سب تم سے بے حد شرمندہ ہیں۔ کمشنر صاحب خود چل کر میرے گھر آئے تھے۔ انہوں نے اور بیگم صاحبہ نے اور سب نے اپنی غلطی کی تلافی کر دی ہے۔ معاف کر دینے میں ہی عظمت ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ سب سے پہلے مجھے اور پھر اس کے بعد اپنے گھر والوں کو بھی معاف کر دو۔ ہم سب تمہاری محبت کی عظمت کے سامنے بہت چھوٹے ہیں۔ اور چھوٹوں کو سزا نہیں دی جاتی۔ درگزر کیا جاتا ہے، تم بھی درگزر کر دو۔۔۔۔۔ دیکھو میں تمہارے سامنے اپنے ہاتھ۔۔۔۔۔“

مولوی علیم نے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرنا چاہی لیکن میں نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور ہم دونوں کی آنکھوں میں چھپے سیلاب بہہ نکلے۔ وہ مجھے تھپکتے رہے لیکن خود کو بھی رونے سے نہ روک پائے۔ میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے چند قدم دُور کھڑے کمشنر صاحب کے پاس لے آئے۔ میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ انہوں نے بچپن کی طرح میرے گال کو زور سے سہلایا۔ اچانک میرے سامنے سے ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا غائب ہو گئے اور میرے بچپن والے بابا آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی بائیں پھیلائی اور میں ان کے سینے میں منہ چھپا کر سسک پڑا، وہ بھی مجھے گلے لگائے روتے رہے۔ برسوں کے بعد ایک باپ نے ایک بیٹے کو گلے لگایا تھا۔ پھر تو کیا تھا، لگتا تھا کہ سارا اسٹیشن ہی وہاں اُمڈ آیا ہے۔ امی، عباد، سجاد، بھابھی، شاکر، نگہت سب ہی مجھے اپنے جگمگٹے میں لیے ہوئے چھوڑے تھے، پیار کر رہے تھے، رورہے تھے، یہ آنسو بھی جذبوں کے اظہار کا کیسا عمدہ ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ اُسی کے لیے آنکھوں سے ٹپکتے ہیں جو آپ کے اپنے ہوتے ہیں، آپ کو پیارے ہوتے ہیں! اور بابا کو تو میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ بھیگی آنکھوں کے

ہاتھ دیکھا تھا۔ غفور ابھی دُور خیر اور دیگر مزدوروں کے ساتھ کھڑا بار بار کانڈھے پر پڑے رد مال سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ آج ان سب کے چہروں پر بھی اک عجیب سی خوشی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اندر سے اُداس بھی تھے۔ شاید وہ جان چکے تھے کہ اب میرا ان سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ چکا ہے۔ لیکن میرا وجود چاہے ان سے دور جا رہا ہو۔ ہر میری رُوح تو ہمیشہ انہی رشتوں کے درمیان موجود رہے گی۔ کچھ رشتے ہمیشہ قائم رہنے کے لیے بنتے ہیں۔ غفور اور خیر وغیرہ کمشنر صاحب کے رعب کی وجہ سے قریب نہیں آ پا رہے تھے۔ بابا نے انہیں دُور سے میری طرف ہاتھ ہلاتے دیکھ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر خود ان کی طرف چلے آئے۔ میں نے ان سب کا بابا سے اسی طرح تعارف کروایا جس طرح میں بچپن میں اپنے دوستوں سے ان کا تعارف کر داتا تھا۔ بابا بھی آج بالکل وہی بچپن والے بابا بن گئے تھے۔ سب سے فردا فردا ہاتھ ملایا اور ان سب کا میرا اتنا خیال رکھنے پر سب کا شکریہ بھی ادا کیا۔ صدیقی صاحب بھی اتنی دیر میں وہاں آ چکے تھے۔ بابا نے بہت دیر تک انہیں گلے سے لگائے رکھا۔ شاید شاکر انہیں صدیقی صاحب اور ان سب کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتا چکا تھا۔

مجھے ان سب نے اسٹیشن سے اس طرح رخصت کیا جیسے میری بارات وہاں سے نکل رہی ہو۔ ہاں۔۔۔۔۔ سچ ہی تو ہے، میرے ساتھ ایمان کی یادوں کی بارات ہی تو تھی۔ وہ مجھ سے جُدا کب تھی۔ ہر لمحہ میرے ساتھ ہی تو رہتی تھی۔ مجھ سے باتیں کرتی تھی۔ میرا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ تنہائی میں میرے آنسو پونچھتی تھی۔ میرے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگاتی تھی۔

گھر واپس آ کر میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ پایا۔ میں نے خود بابا سے کہہ کر لندن میں یونیورسٹی میں داخلے کے فارم منگوا لیے۔ اگلے مہینے ہی یونیورسٹی سے بلاوا آ گیا اور میں نومبر کی ایک سرد شام ایمان کے شہر سے اس کی گلابی یادوں سمیت رخصت ہو گیا۔

”تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں

میرے دل سے یہ بوجھ اتار دو

میں بہت دنوں سے اُداس ہوں

یادوں کی بارات

ایمان چلی گئی اور میں اُس کے جانے کے بعد لندن آ گیا۔ شاید میں بھی کہیں نہ کہیں اپنے ذہن میں اس نظریے کی غلط فہمی کا شکار تھا کہ شاید اس کا شہر چھوڑ دینے کے بعد میرے درد میں کچھ کمی واقع ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اُس کی یاد وہ خنجر تھا جو ہمیشہ میرے دل کے عین بیچ گزرا رہا۔ جب تک لوگ آس پاس ہوتے، ذہن کچھ بٹا رہتا، لیکن تنہائی ملتے ہی مجھے اس کی وہ دو بڑی بڑی آنکھیں گھیر لیتیں۔۔۔۔۔ اس کے دیے ہوئے وہ دونوں موتی اور اس کا آخری خط میرے ساتھی بن جاتے اور گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ حیرت بات ہے کہ اس کی یاد کے آنے سے میری تنہائی ہی میری سب سے بڑی محفل بن جاتی اور لوگوں کے بیچ میں اکثر تنہا رہتا۔ جیسے ہی لوگ میرے پاس آتے میں تنہا ہو جاتا تھا۔ پھر گھنٹوں بیٹھا بھیڑ چھٹنے کا انتظار کرتا تاکہ لوگ جائیں، مجھے تنہائی ملے اور پھر سے اپنی محفل جما سکوں۔ صرف ایک کامران میرے دوستوں میں سے ایسا تھا جسے میرے دل کی حالت کا علم تھا۔ جب گذشتہ دنوں میں نے اُسے ایمان کے چلے جانے کے بارے میں پہلی مرتبہ کھل کر بتایا تو بہت دیر تک تو وہ سکتے کی کیفیت سے ہی نہیں نکل پایا۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرتے رہے۔ آج تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ایمان کی شادی کہیں اور ہو گئی ہوگی، کیونکہ پچھلے دو سال سے نہ وہ پاکستان آیا تھا اور نہ ہی میں نے اسٹیشن پر ملازمت کے بعد اور لندن آنے سے پہلے تک اس سے کوئی رابطہ رکھا تھا۔ کامران اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ مجبوراً مجھے اُسے خواب آور دوا دے کر اس رات سنانا پڑا تھا۔ بہت دنوں تک وہ مجھ سے بھی روٹھا روٹھا سا رہا کہ میں نے اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود اُسے خبر کیوں نہ کی۔ اسے میرے آہنی اعصاب پر بھی حیرت تھی کہ میں اب تک چل پھر کیسے رہا تھا۔۔۔۔۔ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ یہی تو اصل شرمندگی کی بات تھی۔ کاش میرے حواس بھی ایمان کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے

مجھے کوئی شام ادھار دو۔۔۔۔۔
کسی اور کو میرے حال سے
نہ غرض ہے نہ کوئی واسطہ
میں بکھر گیا ہوں
سمیٹ لو۔۔۔۔۔
میں بکڑ گیا ہوں،
سنو اردو۔۔۔۔۔

oo

”یہ رہی تمھاری امانت۔۔۔۔۔ رات کو میرا دھیان بٹانے کے لیے بہت بہت شکریہ۔“
”سرا نزک نے کہیں بعد میں میری جیبوں کی تلاشی تو نہیں لی اکیلے میں۔“ سارہ زور سے اُس پڑی۔

”اب ایسے بھی نہیں ہیں میرے پاپا۔۔۔۔۔ رات کو بھی انہوں نے تمھارے جانے کے بعد خود مجھ سے سوری کہا تھا۔“

”ادہ۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ واقعی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“

ربیکا نے برف سے گیلے اپنے ہاتھ جھاڑے اور پلٹ کر بولی۔

”بھئی میں تو اندر کیسپس میں جا رہی ہوں۔ ورنہ میرے ہاتھ یہیں کٹ کر گر جائیں گے۔“

سارہ اُسے روکتی ہی رہ گئی لیکن ربیکا نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے اگر وہ مڑ کر دیکھتی تو اس کی بھیگی آنکھیں بھی سارہ کو نظر آ جاتیں۔ سارہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”اے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ ہے مسٹر ماد۔۔۔۔۔ تم نے میری سب سے پیاری سیہلی کو اتنا ادا کیوں کر دیا ہے۔ یہ ایسی تو کبھی بھی نہ تھی؟“

”شاید ادا سی میرے آس پاس بکھری رہتی ہے، جو بھی میرے ساتھ رہتا ہے وہ اس ادا سی کے گہرے میں ڈوب جاتا ہے۔“

سارہ نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”تم باتیں بہت خوبصورت کرتے ہو۔ ربیکا بھی تمھاری انہی باتوں سے گھائل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ کچھ بات تو ہے تم میں؟“

مجھے اس کے سوالیہ انداز پر ہنسی آ گئی۔

”یہ سوال ہے یا کوئی فیصلہ۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں نے اپنے پاپا کو کل رات سے زیادہ پریشان اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ وہ بہت مضبوط انسان ہیں۔ زندگی کی ہر بڑی سختی کو انہوں نے مسکراتے ہوئے جھیلا ہے، اسی لیے وہ ہمیشہ سے

چلے جاتے۔ لیکن مجھے تو وہ جاتے جاتے جینے کی سزا سنائی تھی۔ اور میں تھا کہ سزا کے طور پر جیے جا رہا تھا۔۔۔۔۔

ربیکا بھی مجھ سے ہمیشہ یہی گلا کرتی تھی کہ میں سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سب کے بچ نہیں ہوتا۔ جانے کہاں بھٹکتا رہتا ہوں۔ البتہ آج اس کی ناراضگی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ دراصل اُسے میں نے صبح ہی بتایا تھا کہ میں سارہ کے گھر رات کھانے پر مدعو تھا۔ ربیکا رات بھر کی برف باری کے بعد نہر کے ساتھ جمی برف سے اسنوین بنانے کی کوششوں میں مصروف تھی اور اس کوشش میں اس کے سفید ہاتھ پہلے سُرخ اور اب سردی سے نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ یہ بات سنتے ہی وہ برف کا ڈھیر چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے میری جانب لپکی۔

”کیا کیا۔۔۔۔۔ سارہ کے گھر کھانے پر گئے تھے۔ رات کو۔۔۔۔۔ اور مجھے ابھی بتا رہے ہو، یہ بھلا کیا بات ہوئی؟“

”اس نے دو پہر ساڑھے تین بجے مجھے یہ آفر کی تھی تب تک تم جا چکی تھیں۔ شام کو میں لائبریری کھنگالتا رہا اور اب جب تم ملی ہو تو بتا رہا ہوں۔“
ربیکا جانے کیوں رو ہانسی سی ہو گئی۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔

”جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے تمہیں سارہ کے ساتھ دیکھ کر۔ غلطی میری ہی ہے، ایک ہی شخص ہر کسی کے لیے ایک سا ساون نہیں بن سکتا۔ اس کے وجود کی ٹھنڈی بوندیں سبھی پر یکساں نہیں برس سکتیں۔ لیکن مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرے لیے تمھارے وجود کا صحرا ہی غنیمت ہے۔ میں اپنے اس مقدر پر بھی بہت خوش ہوں۔۔۔۔۔“

ابھی ربیکا کی بات مکمل بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اچانک ہی سامنے سے سارہ آتی دکھائی دی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے گہرے سُرخ کی بند گلے کی سویر اور کالی جینز پہن رکھی تھی۔ برف سے بچاؤ کے لیے بند جوتے پہنے وہ ہماری طرف بڑھی چلی آئی۔ اس کے کاندھوں پر وہی جیکٹ تھی جو رات سردی سے بچاؤ کے لیے میں اس کے کاندھوں پر ڈال آیا تھا۔ ربیکا میری جیکٹ کو بہت اچھی طرح پہنچاتی تھی۔ اُس نے غور سے آتی سارہ کو دیکھا اور پھر سے اپنے برف کے ادھ بنے پتلے کی طرف بڑھ گئی۔ سارہ نے قریب آ کر جیکٹ میرے حوالے کی۔

”کہیں نہیں۔۔۔۔۔ بس تمہاری بات سن رہا تھا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ تم میری بات سنتے ہوئے بھی یہاں نہیں تھے، تم کبھی بھی ہم لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتے۔ میں نے آج تک کسی کی آنکھوں میں اداسی کے اتنے بھنور ایک جگہ اکٹھے نہیں دیکھے۔ اگر کوئی بہت ذاتی بات نہ ہو تو تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔“

اب میں اس معصوم لڑکی کو کیا بتاتا کہ میرے ساتھ کتنے غم میرے ابدی ساتھی ہیں۔ میں اسے یہ سب بتا کر افسردہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”داستان اتنی لمبی ہے کہ تم سن سن کر اکتا جاؤ گی۔ ہاں البتہ یہ یقین رکھو کہ اس میں کچھ ایسا ذاتی نہیں ہے جسے تم سے چھپایا جائے۔ جب کبھی ہمیں فرصت ہوئی اور ہم دونوں ساتھ ہوئے تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“

وہ خوش ہو گئی اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

”وعدہ۔“

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”پکا وعدہ۔“

پھر وہی دو ہلکے سے گڑھے اس کے چہرے کا نور بڑھا گئے۔ کلاس کی گھنٹی تیسری بار بج

چکی تھی۔ ہم دونوں ہی وہاں سے چل دیے۔۔۔۔۔

○○

میرے آئیڈیل بھی رہے ہیں۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔۔۔ جب سے تم اس یونیورسٹی میں آئے ہو، میں نے انہیں تمہاری جانب سے کسی نہ کسی الجھن میں ہی مبتلا پایا ہے۔ کل رات بھی میری پاپا سے اسی بات پر بحث ہو رہی تھی کہ کیا وہ مجھے یا میرے عقیدے کو اتنا کمزور سمجھتے ہیں کہ میں اس سے پلٹ جاؤں گی۔ ہمیں بچپن سے یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہم عظیم ہیں اور عظیم رہیں گے۔۔۔۔۔ تو کیا ہماری عظمت کسی ایک لڑکے کے انکار کرنے سے کیا کم ہو جائے گی۔ کیا ہمارا عقیدہ اتنا کمزور ہے کہ کسی اور کا ایمان اس میں دراڑیں ڈال دے گا۔۔۔۔۔؟“

میں چپ کر کے اس پر اعتماد لڑکی کی بات سنتا رہا۔

”پھر تمہارے پاپا نے تمہیں کیا جواب دیا۔“

”مجھے حیرت اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پہلی مرتبہ انہوں نے روایتی باپ کے

روئے سے کام لیا۔ جو دلیل اور لاجب کی بجائے اپنا تجربہ اور خدشات اپنے بچے کے ذہن میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اندر کے خوف سے اسے ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ تم نے اس دن کہا تھا کہ اندھیرا ہمیشہ روشنی سے ڈرتا ہے۔ اگر یہ اندھیرا ہے تو میں خود بھی اس اندھیرے کا ایک حصہ ہوں۔۔۔۔۔ پھر مجھے تم سے تمہارے عقیدے سے خوف محسوس کیوں نہیں ہوتا؟“

سارہ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ سر آنزک کے رویے نے اسے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں اس کی باتیں سن کر یہ سوچتا رہا کہ مغرب اور مشرق کے رویوں میں کس قدر فرق ہے۔ یہاں مغرب میں ایک بیٹی باپ سے اپنے غلط یا صحیح ہونے پر باقاعدہ کسی ملزم کی طرح جرح کر سکتی تھی۔ اس سے لڑ سکتی تھی، روٹھ کر ناراض ہو سکتی تھی جب کہ مشرق میں کسی جوان لڑکی کا باپ کے سامنے یوں کھڑا ہونا بھی محال تھا۔ چہ جائیکہ وہ اپنے باپ سے کوئی سوال کر سکے۔۔۔۔۔ جانے کیوں مجھے اس لمحے ایمان بہت شدت سے یاد آئی۔ سارہ اپنی رو میں نہ جانے کیا کچھ بولتی رہی۔ پھر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کہاں کھو جاتے ہو یوں پل بھر میں۔“

آج اس نے بھی اچانک وہی سوال پوچھ لیا تھا جو ریکا اس سے پہلے کئی مرتبہ پوچھ چکی

تھی۔

جائے گا۔ ربیکا نے کاغذ کی چٹ پر لکھ کر چٹ میری طرف کھسکائی، اُس نے چٹ پر لکھا تھا کہ کیا وہ سر آئزک سے براہ راست پوچھ لے کہ کہیں یہ پابندی میرے ٹرم پیپر کے موضوع کی وجہ سے تو نہیں لگائی گئی۔۔۔۔۔؟ میں نے آنکھیں نکال کر اُسے گھورا تب کہیں جا کر وہ باز آئی ورنہ اس سے کوئی بعید بھی نہ تھی کہ وہ یہ سوال بھی سر آئزک سے کر ہی بیٹھتی۔

اتفاق سے سارہ کے ٹرم پیپر کا تعلق بھی ”ہالوکاسٹ“ سے ہی تھا۔ وہ دراصل فریڈرک کیلو، نامی ایک یہودی مصنف کی تحقیق پر مبنی تھا مقالہ لکھ رہی تھی جس نے ”ہالوکاسٹ“ کے حق میں اپنی تصنیف (روزناموں) میں مختلف دلائل دیے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے بہت سی کتابوں انٹرویوز اور مختلف حوالوں سے اس مفروضے کو حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

سارہ نے مجھ سے کبھی اپنی تحقیق چھپائی نہیں تھی بلکہ وہ مسکرا مسکرا کر مجھے چیلنج کرنے کے انداز میں اپنی روزانہ کی پیش رفت کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ ربیکا پر وہ لے بہت گراں گزرتے تھے جب سارہ میرے ساتھ کسی بحث میں مصروف ہوتی۔

پھر ایک ایسے ہی اُجلے دن جب پوری یونیورسٹی دھوپ سینکنے کے چکر میں چھٹی منانے کے سوڈ میں تھی۔ میں نے ربیکا کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ نہر کنارے اپنی مخصوص بیچ پر بٹھا لیا۔ آج میں نے اس سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ وہ آج میرے اس انداز پر خاصی حیران بھی تھی۔

”بیٹھو یہاں۔۔۔۔۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

اس نے حیرت سے اپنے ہاتھ میں پھنسے میرے ہاتھ کو دیکھا اور پھر ہنس دی۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آج کہیں مجھے پرپوز کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔“ کاش میں اتنا خوش نصیب ہوتا۔ تمہارا ساتھ پانے والا دونوں جہاں پالے گا۔“

ربیکا کی آنکھوں میں بیک وقت بہت سے شرارے لپکے۔

”واقعی۔۔۔ کیا تم ایسا سمجھتے ہو۔۔۔۔۔ مجھ میں تو ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”تمہارے وجود میں اور تمہاری اس خوبصورت روح میں وہ سب کچھ موجود ہے جو دنیا کے کسی بھی نوجوان کے خوابوں کی تمنا ہو سکتی ہے۔ تم جس راستے سے گزر جاتی ہو، لوگ گھنٹوں

خوف

پھر ایک عجیب بات ہوئی، یونیورسٹی انتظامیہ نے اچانک اعلان کر دیا کہ اس سال پہلے کی طرح طالب علم اپنا پرچہ اور تحقیق ہمیشہ کی طرح کھلے ہال میں تمام یونیورسٹی کے سامنے نہیں پڑھیں گے۔ بلکہ تمام اسٹوڈنٹس پہلے اپنا ٹرم پیپر لائبریری میں جمع کروائیں گے اور انتظامیہ اس کی جانچ اور تحقیق کے بعد چند منتخب شدہ پرچوں کو عام طلباء کے سامنے تقریب میں پڑھنے کی اجازت دے گی۔

سارہ اس بات سے بھی شدید جھلائی ہوئی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اصل میں معاملہ کیا تھا۔ سر آئزک نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنی تحقیق کسی بھی صورت میں دوسروں تک پہنچاؤں۔ وہ اس نئی نسل کو ”ہالوکاسٹ“ کا وہی رُخ دکھانا چاہتے تھے اور اسی یقین میں زندہ رکھنا چاہتے تھے جو برسوں سے اس نسل تک پہنچایا جاتا رہا تھا۔ مجھے پہلی بار ایک عجیب سا طمانیت بھرا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ خود کو عظیم کہنے والے اصل میں مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ میرے عقیدے سے خوف زدہ ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خود کو عظیم کہلوانے کا حق اگر کسی کو ہے تو اصل میں وہ ہم ہیں۔ لیکن ہماری عظمت ہم خود اپنے ہاتھوں سے گنوا چکے ہیں۔ اور ان یہودیوں کو یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم پھر سے اپنی اس عظمت گم گشتہ کو پانہ لیں۔

بہت دنوں کے بعد سر آئزک آج کلاس میں پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔ شاید ان کے سر سے بہت بڑا بوجھ ٹل گیا تھا۔ ربیکا پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹے ہی سر آئزک سے پوچھ لیا کہ اس مرتبہ اتنے سالوں بعد یونیورسٹی نے ٹرم پیپر سے متعلق اپنا اصول کیوں بدل لیا ہے۔ سر آئزک نے بڑی خوبصورتی سے اُسے انتظامیہ کا اندرونی معاملہ کہہ کر ٹال دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہر سال کچھ معیاری پرچوں کے ساتھ ساتھ بہت سے غیر معیاری پرچے بھی آ جاتے تھے۔ اس لیے اس مرتبہ منتخب شدہ پرچوں کو ہی منظر عام پر لایا

بھی ہمیشہ بے نور ہی رہے گی۔“

یا خدا۔۔۔ اس لڑکی کو اتنی مشکل باتیں بھی آتی ہوں گی۔۔۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ شاید یہ محبت ہی ہوتی ہے جو ہمیں ایسی کٹھن بولیاں سکھا جاتی ہے۔ ربیکا کا دل بھی ضد پر اڑ گیا تھا۔ محبت پھر سے اپنا صدیوں پرانا کھیل کھیل رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عاشق اور محبوب کی جگہ اور نام بدل گئے تھے۔ باقی ساری چیزیں، ساری کاٹ، سارے گھاؤ وہی تھے۔ کاش ہم انسانوں کو اتنا تو اختیار دیا ہوتا خدا نے کہ اگر ہم خود کو نہیں، تو کم از کم دوسروں کو تو اس آگ سے بھرے گڑھے میں گرنے سے روک سکتے۔ لیکن قدرت کو تو خود یہ تماشا دیکھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ وہ دو انسانوں میں سے کسی ایک کے دل میں دوسرے کے لیے یہ آگ بھڑکا کر اُسے عمر بھر کے لیے سسکتا اور تڑپتا ہوا دیکھنا پسند کرتی ہے۔ قدرت تو اس کھیل کی ازل سے سب سے بڑی کھلاڑی ہے۔ وہ ابد تک ہم انسانوں کو یونہی تڑپاتی سسکتی رہے گی۔ جیسے وہ اس وقت ربیکا کو تڑپا رہی تھی میرے لیے۔ وہ ربیکا جسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ میری روح تو جانے کب کی ایمان کے ساتھ ہی پرواز کر چکی تھی۔ یہ سانس لیتا جسم تو خود اک چلتی پھرتی لاش تھا، محبت کا وہ زہر جو آج اس کی رگوں میں دھیرے دھیرے اتر رہا تھا۔ بہت پہلے میری جان لے چکا تھا۔

ربیکا سر جھکائے بیٹھی اپنے آنسو پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی بلند کی۔ اس کی جھیل جیسی نیلی آنکھوں میں جانے کتنے ہنور مچلنے کو تیار تھے۔

”نہیں۔۔۔ تم نہیں روؤ گی۔۔۔ بہت زل لایا اس محبت نے ہم جیسے بے بس انسانوں کو۔ بہت کھیل لیا ہے اس نے ہمارے جذبات کے ساتھ۔ بہت گھاؤ لگا چکی یہ محبت بہت جد کے سہ لیے ہم نے اس کے چلائے ہوئے اندھے تیروں کے۔۔۔ نہیں ربیکا۔۔۔ تم نہیں روؤ گی۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب اور نہیں۔“

میں اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتا جا رہا تھا اور اُسے رونے سے منع کرتا جا رہا تھا لیکن جس رفتار سے میں اس کے آنسو پونچھ رہا تھا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے مزید آنسو اُٹتے آرہے تھے۔ ربیکا بار بار مجھ سے معذرت کرتی اور نہ رونے کا وعدہ کر رہی تھی لیکن اس

وہاں مسحور بیٹھے رہتے ہیں۔ تمھاری ایک جھلک پانے کے لیے، تم سے دو گھڑی بات کرنے کے لیے میں نے یہیں اسی یونیورسٹی میں جانے کتنوں کو دن رات پریشان دیکھا ہے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ تم میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

میں نے اس بے باک مغربی خُسن کے چہرے پر پہلی مرتبہ شرم کی سُرخی دیکھی۔ عورت دنیا کے کسی خطے کی بھی ہو۔ اس کے اندر کہیں نہ کہیں یہ وصف ضرور موجود ہوتا ہے۔ وہ ہنس کر بولی ”ہاں۔۔۔ کچھ نہ کچھ خاص بات تو ضرور ہوگی تبھی یہ سب آہیں بھرتے ہیں۔۔۔ لیکن وہ خاص بات نہیں جو اس کے پتھر دل کو موم کر دے۔ جس کو میں پکھلانا چاہتی ہوں۔ پھر یہ سب کچھ میرے کس کام کا۔“

تو آج ربیکا نے بھی دل کی بات کھل کر کہنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

ہمارے سامنے ٹینز سے نکلی اس نہر کا برف جیسا پانی نہایت خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ پانی میں جی برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی تیرتے ہوئے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ ایک ایسے ہی برف کے چھوٹے سے سفید سنگ مرمر کی سل نما ٹوٹے پر پرندوں کا ایک جوڑا بیٹھا ہمارے سامنے سے گزرا جو برف میں پھنسی گھاس کے ٹکڑے نکالنے میں مشغول تھا۔ بھوپ سیدھی ربیکا کے سنہری رنگ پر پڑ رہی تھی اور اُس کا چہرہ مزید کندن ہو گیا تھا۔ بلیک سکرٹ اور بلیک ٹاپ میں وہ اس وقت بالکل کا لمخمل میں لپٹی سونے کی ایک گڑیا لگ رہی تھی۔

ربیکا اپنی بات کہہ کر چپ چاپ بیٹھ کر نہر میں چھوٹے چھوٹے کنکر پھینکنے لگی۔ اُس نے کنکر پھینکنے کے لیے ہاتھ ہوا میں اٹھایا تو نہیں نے وہیں اس کی کلائی تھام لی۔

”کیا ضروری ہے کہ سب جذبے، ساری خوشیاں، ہر خواہش کسی ایک شخص سے ہی متصل کر دی جائے؟ ہو سکتا ہے وہ بد نصیب اس انعام کا حق دار ہی نہ ہو؟۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حصے کے سارے رنگ، ساری قوس و قزح پہلے ہی کہیں نہھاڑ چکا ہو؟“

ربیکا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ ”اگر وہ اپنے حصے کی قوس و قزح پہلے ہی کسی اور کی آنکھوں میں ڈھونڈ چکا ہے تو پھر یوں سمجھو کہ میری زندگی میں بھی ہر رنگ سے میرا حق، رنگے بنا ہی چھن چکا ہے۔ میری محبت

اُس دن کے بعد دیریکا بہت دن تک میرے سامنے آنے سے گریزاں رہی۔ شروع کے دو تین دن تو وہ یونیورسٹی ہی نہیں آئی۔ میں نے اُس کے فون پر اور گھر پر رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سب نمبر بند ملتے تھے۔ پھر جب وہ یونیورسٹی آئی بھی تو بہت بکھری بکھری سی تھی، اور مجھ سے نظریں چراتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن مجھے ہیومنیزنگ کی کلاس میں ایک موقع مل ہی گیا۔ اس دن کا موضوع تھا ”پالینے اور کھودینے کا احساس۔“

مجھ سے جب سر آنزک نے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے کہا تو میں نے اک اچنتی سی نگاہ ربیکا پر ڈالی۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ میں نے اصل میں اسی کو مخاطب کیا۔

”احساس اگر محبت کا ہو تو انسان اس میں کبھی کچھ کھوتا نہیں ہے۔ صرف پاتا ہی ہے۔ محبت چاہے ایک طرف ہی کیوں نہ ہو۔ وہ آپ کو اک خوبصورت احساس دے کر ہی جاتی ہے۔ چاہے دوسری طرف کا جذبہ اس کے ہم پلہ نہ ہو تب بھی۔۔۔۔۔ محبت کسی سوداگر کا سودا تو نہیں کہ دونوں جانب کے پلڑے ہمیشہ برابر ہی ہوں، دوسرے کا وزن کم ہونے سے ہمارا وزن تو بڑھتا ہی ہے نا۔ اُس کے محبت نہ کرنے سے ہماری محبت پر کیا فرق پڑتا ہے؟ محبت کسی صلے کی توقع میں نہیں کی جاتی۔ ہاں اگر دوسری طرف سے بھی وہی شدت موجود ہو تو سمجھیں کہ انعام دو گنا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر دوسرے کی کم نصیبی سے وہ اس جذبے سے محروم ہے تو پھر بھی اس بات سے اپنے حصے کا انعام نہیں گنوا یا جاسکتا۔ زندگی بتانے کے لیے اک اپنے حصے کا یہ احساس یہ انعام ہی کافی ہے۔ لیکن یاد رہے، محبت کا یہ سفر ننگے پاؤں ایک جلتے اور تپتے صحرا میں سدا کے لیے نکلے ہوئے سورج تلے چلنے کا سفر ہے۔ پاؤں کے چھالے گننے کے لیے بیٹھ جانے والے اپنی منزل کا نشان کھود دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔“

کے اندر کا سیلاب آج پوری طرح بہہ جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے دُور چلی گئی۔ نہیں اُسے دُور جاتے دیکھتا رہا۔ نہر پر راج ہنسوں کے ایک جوڑے نے پانی کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور تیزی سے پد پھڑ پھڑا کر پانی کے اوپر آ کر بیٹھ گیا۔ ہنسی سے ہنس سے پوچھا۔ ”وہ راج ہنسی رو کیوں رہی تھی۔ اس کا ہنس کہاں ہے؟“ ہنس نے ایک لمبی اڑان بھری اور پھر سے ہنسی کے سر پر منڈلا کر بیٹھ گیا اور بولا۔

”یہ انسانوں کی دنیا بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ اس ہنسی کا ہنس تو کہیں دُور دُور تک نظر نہیں آیا۔ اک ہنس وہاں نہر کنارے بیٹھا تو ہے لیکن اس کی تو اپنی ہنسی کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہ کیسے بے جوڑ سے جوڑے بنا رکھے ہیں تقدیر نے ان انسانوں کے زمین پر۔ ان بے توہم، ہوا کے دوش پر تیرتے راج ہنس ہی بھلے۔ ہم میں سے ہر اک کا اپنا جوڑا تو ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ بھی ہے۔ ہنسی نے اک دکھ بھری نظر دُور بھاگتی ربیکا پر اور پھر مجھ پر ڈالی اور پھر اچھے ہنس کے ساتھ ایک لمبی اُڑان بھر گئی۔ میں وہیں اکیلا، تنہا بیٹھا رہ گیا۔۔۔۔۔

00

مجھے یاد تھا، یہ اسی دن کی بات ہے جس رات میں سارہ کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔
 ”وہاں تمھاری لائبریری میں پیٹر تھا مس کے کچھ بحث بھی ہوئی تھی۔“
 ”اُسے بحث تو نہیں کہا جاسکتا۔ بس وہ مجھے چند کتابیں دینے میں پس و پیش کر رہا تھا جو کہ لائبریری کی فہرست (Catalog) کے حساب سے لائبریری میں ہی موجود ہونی چاہئیں تھیں۔ لیکن یہ واقعہ تو یونیورسٹی سے باہر کا ہے۔ اس سے انتظامیہ کا کیا تعلق۔“
 ”شاید تم نہیں جانتے۔ پیٹر خود بھی روسی نثر ادیب ہودی ہے۔ اُس نے یونیورسٹی انتظامیہ کو اس دن کے حوالے سے، جب تم لائبریری گئے تھے۔ ایک درخواست دی ہے کہ تم نے اُسے کتابیں نہ دینے پر دھمکیاں دی ہیں اور مذہبی طور پر ہراساں بھی کیا ہے۔ اس لیے تمھارے خلاف کارروائی کرنے کی درخواست کی ہے۔“
 مجھے شدید غصہ آ گیا۔

”یہ سب فضول بکواس ہے۔ نہ تو میں نے اُسے کوئی دھمکی دی تھی اور نہ ہی کسی بھی طور پر ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ یہ سب جھوٹ ہے۔“
 ”میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ لیکن تم جانتے ہو کہ انتظامیہ کسی بہانے کی تلاش میں تھی۔۔۔۔۔ اور وہ بہانہ تم نے انہیں فراہم کر دیا ہے۔“

جوزف کے چہرے پر بھی پریشانی کی لکیریں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو میں اس لائبریری میں گیا تھا۔ مجھے فرانسیسی مصنف رابرٹ فوری سن کے دو طویل مقالے چاہیے تھے۔ جو انہوں نے جنوری 1979 اور دسمبر 1978ء میں لکھے تھے۔ جس میں انہوں نے واضح ثبوت دے کر ثابت کیا تھا کہ یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ہلاک کرنے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن لائبریری میں پیٹر نے پہلے تو ان مقالوں کی موجودگی سے ہی انکار کر دیا۔ پھر میں نے اُسے لائبریری کی فہرست دکھائی جس میں باقاعدہ ان دو مقالوں کا اندراج تھا اور فہرست اور رجسٹر یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ پچھلے کئی سالوں سے ان مقالوں کو کسی قاری کو اشوبھی نہیں کیا گیا تھا تو اس کا موڈ آف ہو گیا اور اُس نے مجھ سے کہا کہ میں کل یا پرسوں چکر لگاؤں کیونکہ آج وہ کچھ مصروف ہے۔ اب جب کہ جوزف نے مجھے لائبریری میں پیٹر کی قومیت کے بارے میں بتایا تو مجھے اس کے

میں اپنی بات ختم کر کے بیٹھ گیا۔ چند منٹ تک تب بھی کلاس میں گہرا سکوت سنا چھایا رہا۔ ربیکا کی آنکھیں چھلکنے کو تیار تھیں۔ وہ تو بھلا ہوا اُس گھنٹی کا جو کلاس ختم ہونے کی نشانی کے طور پر بج گئی درنہ آج ساری کلاس ہی ربیکا کے راز سے واقف ہو جاتی۔ ہم سب کلاس سے رفتہ رفتہ نکل گئے۔ میں اپنے خیالوں میں اس قدر رکھویا ہوا تھا کہ مجھے پکارتی جوزف کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ تیسری بار اس نے پکارا تو میں چونکا۔ وہ میرے پیچھے ہی تیزی سے چلا آ رہا تھا۔

”ہے مسٹر حماد۔۔۔۔۔ کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہو۔۔۔۔۔؟“

جوزف نے میرا ہاتھ تھاما اور جلدی سے مجھے لے کر یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی اہم بات بتانا چاہتا ہے جس کے لیے اُسے تنہائی کی ضرورت ہے۔ باہر کھلی فضا میں پہنچتے ہی اُس نے براہ راست مجھ سے پوچھا۔

”اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ تم ”ہالوکاسٹ“ پر اپنے ٹرم پیپر یا اس یونیورسٹی میں اپنے داخلے کے خاتمے میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کر لو، تو تمھارا جواب کیا ہوگا؟“
 ”آپ میرا جواب اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں قدم رکھ کر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”میں جانتا تھا تو پھر ذہنی طور پر تیار رہو۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے تم سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید وہ مجھے بھی اس اجلاس میں نہ بلاتے جو گورننگ باڈی نے کل طلب کیا تھا، لیکن ان کی نظر میں میری وفاداریاں ابھی تک غیر مشکوک ہیں۔ اور پھر شاید اس لیے بھی کہ انہیں آخر میں کہیں نہ کہیں اس فیصلے پر تمام ٹیچرز کے ساتھ میرے دستخط بھی چاہیے ہوں گے۔“

”لیکن اب مجھ پر کیا الزام ہے؟ ٹرم پیپر کو طلباء تک نہ پہنچنے دینے کا تو انہوں نے پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ پھر کیا وجہ ہوئی اس اجلاس بلانے کی۔؟“
 ”تم دو تین دن پہلے پارک اسکوائر ایونیو کی لائبریری میں گئے تھے؟“
 ”ہاں گیا تھا۔“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”پیدل چلنے کی پریکٹس کر رہا ہوں، موسم قاتلانہ ہے، دل جوان ہے اور رستہ طویل ہے۔ سو چلا جا رہا ہوں اپنی دھن میں مگن۔“

سارہ بھی میری بات سن کر ہنس دی۔

”میرے پاس البرٹ ہال میں ہونے والے اسٹیج تھیٹر کے دو ٹکٹ ہیں۔ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پاپا کو تم نے ہزار غموں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ چلو گے میرے ساتھ تھیٹر دیکھنے کے لیے؟“

”ایک خوبصورت لڑکی جب کسی نو جوان کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے جانا چاہتی ہو تو اس کے عقل مند ماں باپ کو اسی طرح کے بہانے کر لینے چاہئیں۔“

سارہ کی ہنسی فون پر اُبھری۔

”کہاں ہو اس وقت؟“

میں نے اُسے اس سڑک کا پتہ بتایا جس پر میں اس وقت مڑگشت کر رہا تھا۔ چند ہی منٹوں میں سارہ کی سفید بٹل کار نمودار ہو گئی۔ اس نے میروں کلر کی اونچے گلے والی سوٹر، بلیک اسکرٹ کے ساتھ پہنی ہوئی تھی اور بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ آج میں نے پہلی مرتبہ اُسے پوری طرح سچ سنوے ہوئے دیکھا تھا۔ ورنہ عام طور پر وہ میک اپ وغیرہ سے بے نیاز سادہ سی رہتی تھی۔ اُس نے گاڑی میرے قریب لا کر روکی۔

”یوں سرد شاموں میں ایک جوان پر دیسی لڑکے کا لندن کی سڑکوں پر تنہا گھومنا کچھ ٹھیک نہیں۔ جلدی سے میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں تمہیں تمہاری منزل پر پہنچا دوں گی۔“

میں مسکراتا ہوا اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں ہم مضافات سے گزرتے ہوئے جاگتے ہوئے جگمگاتے لندن پہنچ گئے۔ چمکتی ہوئی شیشے جیسی دکانیں دونوں اطراف کھلی ہر گزرتے راہی کی توجہ کھینچ رہی تھیں۔ سنٹرل لندن کے بڑے بڑے کسینو (جوئے خانے) شام ہوتے ہی کھل گئے تھے اور باہر کھڑی نیم عریاں لڑکیاں لوگوں کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ یہ سب کئی کئی منزلہ کسینو تھے۔ جن کے اندر جانے کے لیے بڑے بڑے ڈرائیو دے بنے ہوئے تھے۔ آپ اپنی گاڑی سمیت

روئے کی سمجھ آرہی تھی۔ اُس کے انکار کے بعد میں نے ذرا سختی سے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں لائبریری کی اعلیٰ انتظامیہ یا لندن میئر آفس میں لائبریری شعبے میں اس کے سسٹ روئے کی شکایت کر دوں، اس پر اُس نے منہ بناتے ہوئے ان دو میں سے ایک مقالہ مجھے کہیں اندر سے نکال کر دے دیا۔ دوسرے کے بارے میں اُس نے عذر پیش کیا کہ وہ ایک وقت میں دونوں مجھے جاری نہیں کر سکتا لہذا پہلا پڑھنے کے بعد وہ واپسی پر مجھے دوسرا دے گا۔ اور میں پُپ چاپ ایک ہی مقالہ لے کر واپس چلا آیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی، نہ تو میں نے اُس لائبریرین کو کوئی دھمکی دی تھی، نہ ہی اس سے اونچی آواز میں بات ہی کی تھی۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اُسے میری یونیورسٹی کا پتہ کیسے چلا اور وہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ تبھی میرے ذہن میں ڈی کارڈ کا خاکہ سا اُبھرا۔ اوہ۔۔۔۔۔ تو اس نے کتاب جاری کرتے وقت میری یونیورسٹی سے جاری شدہ میرا آئی۔ ڈی (شناختی نمبر) نوٹ کر لیا تھا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ میرے گرد گھیرا تنگ دتا جا رہا تھا۔

جوزف کے بتانے کے بعد میں شام تک بیٹھا اپنے ٹرم پیپر کو حتمی شکل دیتا رہا۔ اب میں جلد از جلد اُسے ختم کر کے پیش کر دینا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب چھ بجے شام یونیورسٹی کے لائبریرین نے بتایا کہ لائبریری بند کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا، باہر واقعی اندھیرا چھا چکا تھا۔ باہر نکلا تو سرد ہوا کے پہلے تھپڑے نے میرا بھرپور استعمال کیا۔ آسمان سرخ انگارہ ہو رہا تھا، برف باری کے آثار واضح ہو رہے تھے۔ گیٹ سے باہر نکلا تو دور دور تک کسی سواری کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے اگلے بلاک تک میٹرو کی تلاش میں پیدل چلنے کا ہی فیصلہ کر لیا، دور لندن شہر کی روشنیاں اب پوری طرح جگمگانے لگی تھیں۔ اونچے اونچے نیون سائن زمین پر اترے ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اچانک میرے اور کوٹ کی جیب میں رکھا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف سارہ تھی۔ اُس کی ملائم آواز فون پر اُبھری۔

”ہے مسٹر حماد۔۔۔۔۔ کبھی ہم یہودیوں کے خلاف مواد اکٹھا کرنے سے باز بھی آ جایا کرو۔ کیا کر رہے ہو؟“

ہیروئن اس بات سے بے خبر ہے کہ اصل میں اس کی لالچی سوتیلی ماں نے بحری قزاقوں کے ہاتھ اس کا سودا کر دیا ہے۔ جو اسی بحری جہاز پر موجود ہیں جس میں اُسے سمندر پار جانا ہے۔ اسٹیج کا منظر لڑکے اور لڑکی کی آخری ملاقات کا منظر تھا۔ جس میں دونوں ہی اس بات سے بے خبر ہیں کہ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ایک سال کے بعد کی ملاقات کے وعدے کر رہے ہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو جھوٹے دلا سے دے رہے ہیں۔ منظر میں جان بھرنے کے لیے دونوں اداکار جم کر اداکاری کر رہے تھے۔ ہدایت کاری اور مکالمے بھی زبردست تھے۔ پورے ہال پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ہیرو جنگل سے گزر رہا ہے۔ پس منظر میں ولیم ورڈزورٹھ کی مشہور نظم "ایک برقی شام میں جنگل میں رکنا" کے مکالمے گونج رہے ہیں۔

"یہ گھنا جنگل

یہ برقی شام

سب کس قدر دلفریب ہیں

لیکن مجھے تو اپنے وعدوں کا بھرم رکھنا ہے

اور سونے سے پہلے

میلوں کا سفر طے کرنا ہے۔۔۔۔۔

اور سونے سے پہلے۔۔۔۔۔ میلوں کا سفر طے کرنا ہے۔"

میں نے شاید ساتویں جماعت میں ولیم ورڈزورٹھ کی "Stopping by woods in a snowy evening" پر پڑھی تھی۔ آج اپنی آنکھوں کے سامنے پھر سے اُس منظر کو حقیقت بننے دیکھ رہا تھا۔ یہاں لئیرے ہیرو پر حملہ آور ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں بحری قزاق لڑکی پر بحری سفر کے دوران جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں ہیرو کے سینے میں خنجر گھونپ دیا جاتا ہے وہاں لڑکی قزاقوں سے بچنے کے لیے سمندر میں کود جاتی ہے۔ یہاں ہیرو مرتے مرتے لئیروں سے التجا کرتا ہے کہ اس کی موت کے بارے میں لڑکی کو نہ بتایا جائے ورنہ وہ بھی مر جائے گی۔ وہاں لڑکی سمندر میں ڈوبنے سے پہلے قزاقوں سے چلا کر زاری کرتی ہے کہ لڑکے کو اس کی موت کی اطلاع نہ دی جائے ورنہ وہ بھی خودکشی کر لے گا۔ دو

اندرونی عمارت جاسکتے تھے، نئی لگنے والی فلموں کے بڑے بڑے بورڈ جل بجھ رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا بورڈ نئی فلم کنگ کاٹنگ کا تھا۔ اصل میں بورڈ کیا تھا، کئی منزلہ بہت بڑا کنگ کاٹنگ ہی تھا جو بجلی کی روشنیوں سے بن رہا تھا، بجھ رہا تھا۔ مجھے کنگ کاٹنگ کا بورڈ دیکھ کر سنی یاد آ گیا۔ اُسے یہ فلم بے حد پسند تھی۔ لیکن وہاں کے سینماؤں میں ابھی کنگ کاٹنگ نہیں لگی تھی۔ اب ہم بڑے پل کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ پل کے گرد بڑی بڑی جہازی ساز کی پیلی روشنیوں نے دن کا سماں باندھ رکھا تھا۔ سنگل بند تھا، شاید کوئی اسٹیمز نیچے سے گزر رہا تھا، خود کار پل درمیان میں سے علیحدہ ہو کر اوپر اٹھ چکا تھا۔ بحری جہاز بھونپو بجاتا ہوا پل کے درمیان سے گزر گیا۔ جہاز کے عرشے پر کھڑے لوگوں نے اپنے شہر کے باسیوں کو دیکھ کر خوشی سے نعرے لگائے۔ ہاتھ ہلا کر وعدہ کیا کہ الوداع اسے شہروں کے شہر لندن۔ ہم چند دن کے لیے تم سے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وعدہ رہا کہ ہم پھر ملیں گے، اور بہت جلد ملیں گے۔ تب تک اپنی اس رنگینی اور جگمگا ہٹوں میں کمی نہ آنے دینا۔ سچ ہے، دنیا کے ہر خطے کے باسیوں کو اپنا شہر ہی دنیا کا سب سے خوبصورت شہر لگتا ہے۔ مجھے اپنا کوئٹہ بھی اسی طرح اور اتنا ہی پیارا تھا۔ اس شہر کی فضا میں میری ایمان کی مہک بسی ہوئی تھی۔ اس کی دسمبر کی شاموں میں بھی ابھی تک کچے کوئلے کے جلنے کی میری پسندیدہ خوشبو موجود تھی، جو بچپن سے ہی میری روح کو کھینچ لیتی ہے۔ یہ شہر بھی ہمیں کس طرح خود سے باندھ لیتے ہیں۔ جیسے کوئی خون کا رشتہ ہو ان سے۔

سارہ گاڑی بے حد تیز چلا رہی تھی۔ پل جڑتے ہی تھوڑی دیر میں ہم البرٹ ہال کی پارکنگ میں موجود تھے۔ ہال میں بہت بھیڑ تھی۔ ضرور کوئی خاص تھیٹر تھا۔ ہماری نشستیں دوسری رو میں ہی تھیں۔ ہمارے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی ہال کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ سامنے اسٹیج کا پردہ اٹھادیا گیا۔ محبت کی کوئی کہانی تھی۔ کہانی محبت کی ہی ہو سکتی ہے۔ محبت ہی تو ایسی لاکھوں کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ اسٹیج پر ہیرو، ہیروئن سے وداع لے کر رخصت ہو رہا تھا کیونکہ اسے اپنے قہبے سے کہیں دو ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن ہیرو نہیں جانتا کہ راستے میں جو گھنا جنگل پڑتا ہے وہاں چھپے لئیرے اس کی زندگی کی تاک میں ہیں۔ وہاں ہیروئن کی سوتیلی ماں اسے بحری جہاز کے ذریعے مزدوری کے لیے دو دروازے کے شہر لندن بھیج رہی ہے۔

ہزار محبتوں جیسی خوش اور تجربہ دے جاتی ہے۔“

سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”گو یا تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟“

”جانے کیوں کبھی کبھی یہ لفظ محبت مجھے بہت نا کافی معلوم ہوتا ہے۔۔۔ کبھی کبھی تمہیں

ایسا نہیں لگتا کہ ہمارے لفظوں کی وسعت اور ویکیلری بہت محدود ہے۔ ہماری زبان،

ہمارے لفظ اور ہماری لغت صرف ظاہری اور اوپری احساسات کو ہی بیان کر سکتے ہیں۔۔۔

بات صرف محبت، عشق اور جنون پر ہی آ کر کیوں ختم ہو جاتی ہے؟ جو جذبہ جنون اور دیوانگی

سے بھی بڑھ جائے۔ اُس کے لیے کوئی دوسرا نام کیوں نہیں ہوتا ہمارے پاس؟

سارہ غور سے میری بات سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر عقیدت سی تھی۔ کچھ ضبط جیسے

اندر ہی اندر کچھ مارنے کی کچھ دبانے کی کوشش کر رہی ہو۔

”کیا نہیں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ خوش نصیب جس کے لیے تمہارے جذبات، تمہارے

لفظ کم پڑ جاتے ہیں، اس وقت کہاں ہے۔؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔۔۔۔۔“

سارہ کے ہاتھوں سے اسٹیرنگ چھوٹے چھوٹے بچا، گاڑی برقی سڑک پر زور سے

لہرائی سارہ مزید بوکھلا گئی۔ میں نے سیٹ کے ساتھ لگی ہینڈ بریک کھینچ دی۔ گاڑی اپنے ہی

زور پر گھومی اور کچھ دیر بھستتی ہوئی ڈورنٹ پاتھ کے ساتھ لگ کر رک گئی۔ سارہ نے اپنا سر

اسٹیرنگ پر رکھ دیا۔ میں نے جلدی سے اُسے ہلایا۔

”تم ٹھیک ہو۔۔۔۔۔ معذرت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ مجھے تمہیں اس طرح سے نہیں بتانا

چاہیے تھا یہ سب کچھ۔۔۔۔۔ غلطی میری ہی ہے۔“

سارہ نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں ہی تمہاری باتوں میں اس قدر

کھوئی ہوئی تھی کہ اپنا اختیار کھو بیٹھی۔“

”تم کہو تو باقی راستہ میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔“

سارہ نے کچھ نہیں کہا اور پُپ چاپ اسٹیرنگ سائنڈ سے اتر کر میری طرف آ گئی۔

محبت کرنے والے ایک بار پھر فنا ہو جاتے ہیں۔ ہال میں بیٹھے تقریباً سبھی لوگوں کی آنکھوں

میں آنسو ہیں۔ عورتوں کی تو باقاعدہ سسکیاں سنائے میں سنائی دے رہی تھیں۔ پردہ گرنے

کے بعد بھی بہت دیر تک سب لوگ مبہوت سے بیٹھے رہے۔ اور پھر اچانک ہی ہال تالیوں کی

بے پناہ گونج سے دبل سا جاتا ہے۔ میں نے سارہ کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں کے

گوشتے بھی بھیکے ہوئے تھے۔

میں اور سارہ جب ہال سے باہر نکلے تو لندن برف کی سفید مٹلی چادر سے ڈھک چکا

تھا۔ پارکنگ میں کھڑی سارہ کی سفید فوکی (بیل) زمیں پر پڑی برف کا ہی ایک حصہ لگ

رہی تھی۔ جیسے شریر بچوں نے سنو مین کی جگہ برف کی گاڑی بنا ڈالی ہو۔ جب تک ہم البرٹ

ہال کی قریبی گلیوں سے نکل کر بڑی شاہراہ پر آئے تب تک لندن کی رات سوچکی تھی۔

سارے شہر پر جیسے کسی نے سفید برادہ چھڑک کر اس پر جادو کر ڈالا ہو۔ دُور کہیں ٹریفالگر

اسکوائر کے گھنٹہ گھر نے رات کے بارہ بجنے کی نوید سنائی۔

ہماری گاڑی برف سے بھری سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھی۔ سارہ ابھی تک تھیسٹر کے اثر

میں تھی اور پُپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وینڈسکرین سے باہر دیکھ رہی تھی، میں خود

بھی کھویا کھویا سا تھا، پھر سارہ نے ہلکے سے کہا۔

”مجھے ایسی محبتوں کا انجام ہمیشہ سے بہت اُداس کر دیتا ہے۔ پھر نہیں گھنٹوں یونہی گم

صم سی رہتی ہوں۔“

”محبتوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔“ میرا جواب سُن کر اُس نے چونک کر میری طرف

دیکھا۔

”تم محبتوں کے بارے میں اتنی گہرائی سے کیسے جانتے ہو۔ اس دن تم نے محبت کے

پہروں کو جب بیان کیا تھا تو میں بہت دن تک ماما سے تمہارے محبت کے بارے میں

خیالات پر بات کرتی رہی۔ پھر اس دن تم نے ایک طرفہ محبت کی بات بھی کی اور اُسی کو محبت کی

شام بنا لینے کا مشورہ بھی دیا۔ کوئی محبت کے بارے میں اتنی تفصیل سے کیسے جان سکتا ہے

۔۔۔۔۔ اس کے لیے تو اُسے ہزار محبتوں کے عذاب جھیلنا بھی کم پڑے ہوں گے۔“

”کبھی کبھی ایک محبت ہی ہزار محبتوں پر بھاری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ہزار محبتوں جیسا درد،

”تم اگر چاہو تو یہیں کچھ دیر میرا انتظار کر سکتے ہو، میں جلد ہی آ جاؤں گی۔“

سارہ میرے رُکے قدم دیکھ کر یہ سمجھی تھی کہ شاید میں یہودیوں کے چرچ کے اندر آنے سے ہچکچا رہا ہوں۔ سارہ آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے برف پر بنے اس کے قدموں کے نشانات پر چلتا ہوا اس چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ چرچ کے اندر اونچی اونچی دیواروں کے اندر بنے ہوئے طاقوں میں ہلکی ہلکی سی روشنیاں جل رہی تھیں۔ چرچ میں مدہم سی ایک خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ڈائس پر جہاں پادری کھڑا ہوتا ہے، وہاں لکڑی کے چوبارے پر بہت سی موم بتیاں رکھی جل رہی تھیں۔ سارہ لکڑی کے چوبی فرش پر چلتی ہوئی ایک خاص جگہ پر آ کر رُک گئی۔ اور زیر لب توریت کی کچھ آیتیں پڑھنے لگی۔ میں چپ چاپ دونوں اطراف پر لگی ہوئی لمبی لمبی بیچوں میں سے ایک پر کونے میں بیٹھ گیا۔ چرچ میں عجیب سا سکوت طاری تھا، اتنی خاموشی تھی کہ موم بتیوں کے جلنے سے پیدا ہونے والی آواز کی سرسراہٹ بھی گونج رہی تھی۔ سارہ ایک جذبے کے عالم میں کھڑی اپنے دُعا کیے کلمات پڑھ رہی تھی۔ ایک انجانی لڑکی ایمان کے لیے ہزاروں میل دُور اس تنہا رات میں بھیگی پلکیں لیے دُعا کر رہی تھی۔

میں کچھ دیر یونہی سارہ کو سینے پر ہاتھ رکھے دُعا کرتا دیکھتا رہا۔ پھر یکایک جانے کیوں مجھے ایمان کی بے حد کمی محسوس ہوئی۔ اس احساس نے میرے دل کو جیسے ایک خنجر سے چیرنا شروع کر دیا کہ اب میں اس زندگی میں کبھی اس سے نہیں مل پاؤں گا۔ اور جانے کس وقت میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو نپکنا شروع ہو گئے اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا، سارہ دُعا ختم کر کے میری طرف پلٹی اور اس کی نظر میری برستی آنکھوں پر پڑ گئی۔

”ہے حماد۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔؟“

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی میری طرف بڑھی اور میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر اس نے اپنی نازک انگلیوں سے میرے آنسو پونچھ دیے۔ اور شاید یہی لمحہ ان آنسوؤں کے سیلاب کے بند کو توڑنے کا آخری بہانہ بن گیا۔ پھر میرا خود پر اختیار ہی نہیں رہا اور جانے کتنی دیر تک یہ نمکیں پانی اس کی نازک ہتھیلیوں کو بھگوتا رہا۔ مجھے تسلیاں دیتے دیتے وہ خود بھی نڈھال سی ہو گئی۔ پھر جیسے اُس نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ ان تمام آنسوؤں کو بہہ جانے دے گی۔ اس نے میرا سراپے شانے سے لگا لیا اور میری پلکوں سے گرتی شبنم اپنی آنکھوں میں

میں بھی دروازہ کھول کر اُس کی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سارہ ابھی تک گرم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہ سامنے ونڈسکرین میں سے باہر دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

”اتنا بڑا درد دل میں رکھ کر تم کیسے مسکرا لیتے ہو۔۔۔۔۔ کبھی کسی کو اپنے اندر کے زخم جھانک کر دیکھنے کا موقع بھی نہیں دیا۔۔۔۔۔ واقعی۔۔۔۔۔ تم سب سے الگ ہو۔۔۔۔۔ سب سے جدا ہو۔۔۔۔۔ اس دُنیا کے نہیں ہو۔۔۔۔۔“

میں چپ چاپ گاڑی چلاتا رہا۔ ویسٹ منسٹر برج سے کچھ پہلے پکاڈلی سے تیسری سڑک کے قریب سارہ نے مجھے گاڑی ایک بہت ہی کشادہ لیکن انجانی سی سڑک پر موڑنے کا کہا۔ میں نے بناء کچھ پوچھے گاڑی اس لمبی چوڑی سنان سی سڑک پر موڑ دی۔ کچھ دُور چل کر سڑک کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا سا چوراہا تھا، اتنا بڑا کہ اس کے گرد گھومنے کے لیے گاڑی کا پورا اسٹیرنگ گھمانا پڑتا تھا، یہیں سے سڑک چار حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ چوراہے کے اندر ایک بہت بڑا فوارہ لگا ہوا تھا جس میں سے پانی کی دھاریں سردی کی وجہ سے نکلتے نکلتے جم گئیں تھیں۔ چوراہے سے مُڑتے ہی سڑک کے آخر میں بنا یہودیوں کا ایک بہت ہی قدیم، سفید پتھر سے بنا ایک عظیم الشان چرچ سامنے آ گیا۔ چرچ کی سفید عمارت اس وقت برف سے اٹی ہوئی کسی پری کا محل لگ رہی تھی۔

میں نے گاڑی چرچ کے سامنے لے جا کر روک دی۔ چرچ کے دیو بیکل چوبی دروازے پر حضرت موسیٰ کی ایک شبیہ بنی ہوئی تھی اور دروازے کے دونوں اطراف بڑی بڑی سے مشعلیں جل رہی تھیں۔ سارہ گاڑی سے اُتر گئی۔۔۔۔۔ میں بھی نیچے اُتر آیا۔ سارہ نے میری جانب دیکھا۔

”یہ میری پسندیدہ عبادت گاہ ہے۔۔۔۔۔ میں صرف خاص موقعوں پر یہاں آتی ہوں۔ آج یوں آدھی رات کو یہاں آنے کا مقصد بھی بہت خاص ہے۔۔۔۔۔ میں تمہاری محبت کے لیے دُعا کرنے آئی ہوں، وہ ہستی جو آج تمہارے لفظوں میں تمہاری یادوں میں اور تمہارے احساس میں زندہ ہے میں اس کے لیے یہاں دُعا کرنے آئی ہوں۔“

میں گنگ سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ سارہ نے قدم بڑھائے، پھر وہ پلٹ کر بولی۔

جھینپ سی گئی۔

میں نے سارہ کی طرف دیکھا وہ ابھی تک اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ میں نے سائڈ والی کھڑکی میں جھک کر اُسے کہا۔

”میں شکر یہ جیسے چھوٹے لفظ ادا کر کے تمہارے انمول احساسات کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس رات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

سارہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”شکر یہ ادا کرنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں۔۔۔۔۔ یقین جانو۔۔۔۔۔ میں نے ہمیشہ ہی تمہیں دوسروں سے بہت مختلف سمجھا ہے۔۔۔۔۔ اور گزری ہوئی رات کے بعد تمہاری عزت میرے دل میں اپنی آخری حد تک بڑھ گئی ہے۔۔۔۔۔ یاد رکھو۔۔۔۔۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہوگی۔۔۔۔۔ تم ہمیشہ آواز دینے سے پہلے مجھے اپنے سامنے پاؤ گے۔“

”میں جانتا ہوں ایسا ہی ہوگا۔ اور یہ احساس میرے لیے ہمیشہ بہت قیمتی رہے گا۔“ مجھے سارہ نے شام کو لائبریری سے واپسی پر آتے ہوئے تھیر کے لیے لیا تھا۔ میرا بیگ جس میں میرے نوٹس تھے اب بھی اس کی گاڑی کی کچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے کل شام ہی اپنا ٹرم پیپر مکمل کر لیا تھا۔ میں نے بیگ سے اپنے ٹرم پیپر کے تمام نوٹس نکالے جس پر میری دو مہینے کی محنت میری تحقیق لفظوں کی صورت میں نکھری ہوئی تھی۔ میں نے ٹرم پیپر کی پوری فائل سارہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

یہ میرا ٹرم پیپر ہے۔ اس میں میری تمام تحقیق موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنے پاس رکھو۔ اور اگر کسی وجہ سے میں اسے یونیورسٹی میں جمع نہ کر داسکوں تو میری جگہ تم اسے لائبریری ریکارڈ کا حصہ بنوانے کے لیے جمع کروا دینا۔“

سارہ نے حیرت سے فائل کے صفحے پلٹے۔

”تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ مجھے اسے اپنے پاس رکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں اسے خود چل کر جمع کروائیں گے۔ بلکہ میں پاپا کو اس بات کے لیے بھی مجبور کروں گی کہ وہ تمہیں تمہارا ٹرم پیپر پوری یونیورسٹی کے سامنے فائل تقریب میں خود پڑھنے دیں۔ تمہیں اپنا نظریہ سب کے سامنے پیش کرنے کا پورا حق ہے۔“

سموتی رہی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں مناسب سمجھوں تو اپنے دل کا غبار اس کے سامنے بیان کر دوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ میرے درد کو اپنا ہی درد سمجھتی ہے اور درد کا درماں بننا چاہتی ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک تمام فسانہ سارہ کو سنا دیا۔ وہ چپ کر کے خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ مجھے تھکتی رہی۔ کئی مقام پر مجھے ایسا لگا کہ وہ خود پھوٹ پھوٹ کر رو دے گی لیکن اس بہادر لڑکی نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ شاید اُسے اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ اگر اس مرحلے پر اُس نے ذرا سی بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا تو پھر مجھے ٹوٹنے سے بچانا ناممکن ہو جائے گا۔ میری بات ختم ہونے کے بعد وہ بہت دیر تک خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ اس کو مل اور پھول کی پگھڑی سی نازک لڑکی کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔ لیکن اُس نے مجھ پر اپنے اندر کے طوفان ظاہر نہیں ہونے دیے۔ کبھی کبھی لفظوں سے زیادہ وہ انسانوں کے بیچ کی خاموشی، مضبوط اور زود اثر مرہم ثابت ہوتی ہے۔ اُس وقت وہی خاموشی ہم دونوں کے درمیان، باتوں کا کام دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ میرا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی اور اپنے لفظ اپنا مرہم، اپنے نرم لمس کے ذریعے میرے ہاتھوں میں اور میری روح میں منتقل کرتی رہی۔ چرچ کے بڑے بڑے روشن دانوں اور کھڑکیوں سے صبح کی سفیدی جھلکنے لگی تھی اور جب ہم چرچ سے باہر نکلے، سحر کے سپیدے اور برف کی چادر کی سفیدی نے ہماری آنکھیں چندھیا سی دیں۔ برف پر ابھی تک میرے اور سارہ کے اندر جاتے قدموں کے نشان واضح تھے۔ رات کے اندھیرے میں نہ جانے کیسا جادو ہوتا ہے۔ شاید اسی سحر کے زور میں، میں نے رات کو سارہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ سب کچھ بتا دیا تھا لیکن اب صبح ہوتے ہی میں اپنی رات کی حالت پر اس کے سامنے شرمندہ سا تھا۔ کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن سارہ نے جیسے اس دن میرا ہر بھرم قائم رکھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس نے میری طرف دانستہ دیکھنے سے گریز کیا۔ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتی رہی۔ پہلے اُس نے مجھے میرے اپارٹمنٹ پر ڈراپ کیا۔ لندن ابھی تک بے خبر سو رہا تھا، میں گاڑی سے اُترتا تو میرے قریب سے گزرتے دودھ کی بوتلیں پہنچانے والے کی سائیکل گھنٹی بجاتی گزری۔ اُس نے اپنی پی کیپ اٹھا کر چلتے چلتے مجھے انگریزی سلام کیا۔ اور مسکرا کر سارہ کی طرف دیکھا۔ سارہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر

”کوئی اور یقین کرے نہ کرے۔۔۔۔ مجھے خود تو یقین ہے اپنی بات پر، اپنے سچ پر، اور پھر وہ سب بھی جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے۔ بس کسی نے ہمت نہیں کی آج تک ان کے سامنے سچ بولنے کی، لیکن میں یہ سچ ان کے سامنے لا کر رہوں گا پوری یونیورسٹی میں اگر ایک بھی طالب علم نے میری بات کا یقین کر لیا تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اور میری محنت رنگ لے آئی۔ چاہے اس کے بعد وہ لوگ میرا ٹرم پیپر جلادیں اور مجھے اس ملک سے ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیں۔“

کامران جھنجھلا سا گیا۔

”لیکن اس جدوجہد کا فائدہ۔۔۔۔ یہ سب تم کس کے لیے کر رہے ہو۔ اس تحقیق کا اور تمہارے اس سچ کا کوئی مقصد بھی تو ہونا چاہیے۔“

مجھے کامران کی بات پر غصہ آ گیا۔

”تو کیا جو کچھ میں نے ابھی تمہیں بتایا، تمہیں اس میں کوئی مقصدیت نظر نہیں آتی؟ اور اگر اس سچ کا تمہیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا کہ یہ نئی نسل ان یہودیوں کے اس جھوٹ کو جان لے تو پھر میرا ایک اور مقصد بھی سن لو۔ جو اس مقصد سے کہیں بڑا ہے۔“ ہالوکاسٹ“ کا یہ تمام پروپیگنڈا یہودیوں نے صرف اور صرف فلسطین کی سرزمین پر اپنی ایک آزاد ریاست بنانے کا خواب پورا کرنے کے لیے کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے کی پوری تیاری کر لی گئی تھی۔ اس وقت چندہ جمع کرنے کی عظیم الشان مہم شروع کر دی گئی تھی۔ امریکہ، برطانیہ اور روس نے جرمن قوم کو برباد کرنے کے لیے یہودیوں کو غدار پر آمادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زخم خوردہ جرمن قوم پلٹ کر ان پر دار ضرور کرے گی۔ وہ جرمنوں کو ہٹلر کی قیادت میں یکجا ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور ہٹلر کے عزائم بھی اس کی جنگی تیاریوں سے بالکل واضح تھے۔ اسی لیے انہوں نے یہودیوں کو قبلہ اول پر قبضے کا خواب دکھایا اور اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ان کی پوری مدد کرنے کا یقین بھی دلایا۔ ”ہالوکاسٹ“ کا الزام تو ہٹلر اور جرمنوں پر دوسری جنگ عظیم کے بعد لگایا گیا تھا۔ لیکن اس کی قیمت فلسطین کے مسلمانوں نے یہودی بستیوں اور پھر اسرائیل کی صورت میں چکانی۔ اگر ہٹلر ”ہالوکاسٹ“ کا ذمے دار تھا بھی تو یہودی اس بہانے فلسطین کے مسلمانوں پر کیوں ٹوٹ پڑے۔۔۔۔؟ اور

میں نے اس موقع پر اسے پیروالی بات بتا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ہلکے سے اس کے ریشمی بال بکھیر دیے۔ وہ مسکرا دی۔ میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں اپنی سنسان گلی کے آخری کونے تک اس کی گاڑی کو مڑتے ہوئے دیکھنے کے لیے کھڑا رہا۔ اوپر آیا تو کامران جاگ چکا تھا اور اپنے کارڈ بار پر جانے کی تیاری میں تھا۔ اُس نے کافی کاگ میرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”آگیا میرا شہزادہ ساری رات آوارہ گردی کرنے کے بعد۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا تا کہ اس یہودی حسینہ سے دور ہی رہنا۔ لیکن لگتا ہے میرے مشورے کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔ پہلے تو صرف دن ہی اس کی زلفوں تلے بسر ہوتا تھا۔ اب راتیں بھی انہی کے ساتھ مٹر گشت کرتے ہوئے گزرتی ہیں۔ یار میڈی۔۔۔۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ اس کا باپ بڑا کائیاں آدی ہے۔ جانے اب تک تمہیں یونیورسٹی میں کس دل سے برداشت کر رہا ہے؟“

شاید کامران نے کھڑکی سے مجھے سارہ کی کار سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا میں نے اُسے کل یونیورسٹی میں جوزف کی طرف سے دی ہوئی پیٹروال شکایت کی خبر سنائی۔ کامران نے زیر لب ان یہودیوں کی شان میں کچھ کہا اور پھر مجھ پر بھی بگڑتے ہوئے کہنے لگا۔

”اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ان لوگوں سے پنگانہ لینا۔ تم یہاں کے قانون سے خود اچھی طرح واقف ہو۔ اس لائبریرین پیٹر کی شکایت پر تمہیں انگلینڈ سے ڈی۔ پورٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کی ہر بڑی انڈسٹری میں انہی یہودیوں کا پیسہ لگا ہوا ہے۔ قانون بھی انہی کا ساتھ دے گا۔ اور پھر 9/11 ٹائن الیون کے بعد تو ہر مسلمان پہلے ہی ان کی نظر میں ایک دہشت گرد ہے۔ صرف کسی شکایت کی ضرورت ہے۔ انہیں لیبل چسپاں کرنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ جانے کتنے لوگوں کو تو یہ صرف شبہ میں ہی ملک بدر کر چکے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا اس ٹرم پیپر کی آخراہی کیا اہمیت ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ ”ہالوکاسٹ“ کا واقعہ ہوا تھا تو کہنے دو۔ ہماری بلا سے تمہیں کون سے میڈل مل جائیں گے اس حقیقت سے انکار کرنے پر۔ اور پھر سننے والے تو خود وہ ہیں جنہوں نے یہ مفروضہ گھڑا ہوا ہے۔ کون تمہارے ٹرم پیپر پر اور تمہاری تحقیق پر یقین کرے گا؟“

میں نے کامران کی طرف دیکھا۔

کوشش ہر مسلمان کے دل میں اس نقصان کے احساس کو جگانا ہے تو پھر اس کے لیے کوئی بھی قربانی بہت ہی چھوٹی ہوگی۔ میری نا سمجھ سوچ اتنی آگے کہاں سوچ سکتی تھی۔“

”میں کبھی بھی اپنے ایمان کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکا۔ نہ ہی کبھی میں نے کامل مومن ہونے کا کبھی سہنا ہی دیکھا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، ان یہودیوں کے بیچ رہ کر مجھے احساس ہوا کہ ضرور ہم میں کوئی خاص بات ہے۔ یہ آخر ہم سے اس قدر خوف زدہ، اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔ اسی اپنی خاص بات کی کھوج نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ دُعا کرنا کہ میرے قدم آگے کہیں لڑکھڑانہ جائیں۔ میں بارش کا پہلا قطرہ ہی سہی۔۔۔۔۔ لیکن برسوں کا ضرور۔۔۔۔۔ شاید میرے بعد ہی سہی۔۔۔۔۔ کچھ قطرے اور برس جائیں۔۔۔۔۔ شاید چند بوندیں ہی سہی۔۔۔۔۔ پر ہمارے دلوں پر صدیوں کا لگا زنگ کچھ حد تک ہی دھل جائے۔“

کامران نے مجھے تھکتے ہوئے کہا اور اس کی آواز رندھی گئی تھی۔

”ضرور دھلے گا یہ زنگ۔ کیسے نہیں دھلے گا ہمارے دلوں پر لگا یہ زنگ۔۔۔۔۔“

جب برسنے والی بوندیں ایسے آبِ زم زم کی ہوں گی۔ کون سا زنگ ہے جو اس آبِ حیات کے آگے ٹھہر سکے۔“

کامران مجھے تھکتا رہا۔۔۔۔۔ ہم دونوں نے ہمیشہ زندگی بہت لا اُبابی انداز میں گزاری تھی۔ لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ کہیں نہ کہیں آج کوئی بات ہم دونوں ہی کے دلوں کو چھو گئی ہے۔ شاید زندگی ایسے ہی موڑ بدلتی ہے۔ شاید دلوں کے انقلاب اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔ شاید ہم سبھی کے دلوں پر لگا یہ زنگ کسی آبِ زم زم کی تلاش میں جمار ہوتا ہے۔ شاید ہم سب کے دل ہی بہت زمانے سے قابی چاہتے ہیں۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی نیند بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ دل کے ہر زنگ پر وقتی طور کے لیے پردہ ڈال دیتی ہے۔ انسان کو خود سے بھی نظر پڑانے کا ایک موقع فراہم کر دیتی ہے۔

سچ یہی ہے کہ ”ہالوکاسٹ“ میں پچاس لاکھ سے ساٹھ لاکھ تک یہودیوں کے مارے جانے کی کہانی صرف اور صرف مفروضہ ہی ہے۔ اتنے بڑے اور اتنے وسیع پیمانے پر گیس چیمبرز کا بنایا جانا ہی ممکن نہیں تھا۔ جن گیس چیمبرز پر یہودی ”یہودی قاتل گیس چیمبرز“ ہونے کا الزام لگاتے ہیں وہ صرف جرمن فوجیوں کی لاشوں کو جنگ کے دوران ٹھکانے لگانے کے لیے بنائے گئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان چیمبرز کو بھی ٹھیک طرح سے چلانے کے لیے جرمنوں کے پاس پورا ایندھن موجود نہیں ہوتا تھا۔ جرمن پہلے ہی اپنا سب کچھ جنگ میں جھونک چکے تھے۔ ان گیس چیمبروں میں جھونکنے کے لیے ان کے پاس کوئلہ تک کافی مقدار میں نہیں بچا تھا۔ یہ صرف اور صرف ایک صیہونی تحریک ہے جس کا مقصد اپنے مفاد کے لیے ہلاکتوں کی تعداد میں زبردست مبالغہ چاہتی ہے۔ تاکہ خود کو مظلوم ثابت کرنے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جاسکیں۔ یاد رکھو، جس قدر یہ لوگ اس مبالغہ آرائی میں کامیاب ہوں گے، فلسطین کے مسلمان اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت چکانیں گے۔ یہ تحریک صرف معاشی فائدہ اور مسلمانوں کی زمین حاصل کرنے کے لیے چلائی گئی تھی اور یہودی اس تحریک میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ لوگ ان کے جھوٹ کو سچ سمجھتے ہیں اور ہمارا سچ بھی انہیں جھوٹ لگتا ہے۔ آخر کسی کو تو پہل کرنی ہی تھی۔ یاد رکھو، ہمارا زوال اسی دن شروع ہو گیا تھا جس دن ہم نے خود کو صرف مسلمان سمجھنے کے بجائے فلسطینی، مصری عرب اور پاکستانی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ آخر اس دنیا کے کسی بھی کونے میں ہونے والا یہودی کا فائدہ، دنیا کے دوسرے کونے میں بیٹھے کسی بھی یہودی کا فائدہ ہو سکتا ہے تو پھر دنیا کے کسی بھی مسلمان کا نقصان میرا نقصان کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ تمہارا نقصان کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔؟“

کامران چپ چاپ ایک ہی جگہ کھڑا میری ساری تقریر سنتا رہا۔۔۔۔۔ میں بھی تھک کر وہیں صوفے پر ڈھلے سا گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے کاندھے پر کامران کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا، میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، اس نے میرا بازو کھینچ کر مجھے کھڑا کر دیا اور گلے سے لگا

لیا۔

”بر دفعہ، ہر بازی تم اکیلے ہی کیوں مار جاتے ہو۔۔۔۔۔ بچپن سے ہر مرتبہ تم سے ہارتا آیا ہوں۔ لیکن جتنا مزہ آج اس ہار میں آیا ہے۔ پہلے کبھی نہیں آیا، اگر مقصد آتا بڑا ہے اور

ادارے میں کچھ طالب علم مذہبی سیاست کو ہوا دینے کا باعث بن رہے ہیں، جس کی وجہ سے شہر میں بھی بے چینی پھیل رہی ہے۔ تو تم ایسی صورت میں کیا کرتے۔“

”میں پوری چھان بین کرتا اور میرٹ اور حق پر فیصلہ کرتا۔ آپ سے بھی مجھے انصاف ہی کی توقع ہے کیونکہ آپ کو بحیثیت سربراہ پوری تحقیق کا فرض بھی سونپا گیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ ایک فرض شناس استاد بھی ہیں۔ آپ کا فرض انصاف ہے۔“ سر آئزک نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میرے چہرے پر طنز یا تلخی کی کوئی جھلک ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر سر جھٹک کر بولا۔

”کیا تم مسٹر پیٹر سے پہلے بھی مل چکے ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ اکثر سنٹرل اسکوائر کی لائبریری جاتا ہوں۔ وہاں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔“

”کیا تم 13 جنوری کی شام بھی سنٹرل اسکوائر لائبریری گئے تھے؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ مجھے دو مقالے چاہیے تھے جن سے میرے ٹرم پیپر کی تکمیل میں مجھے کافی مدد مل سکتی تھی میں وہی لینے گیا تھا۔“

”مسٹر پیٹر نے تمہارے خلاف تحریری شکایت جمع کروائی ہے کہ 13 جنوری کی شام تم نے انہیں کچھ خاص کتابیں جاری نہ کرنے پر مذہبی طور پر ہراساں کیا تھا اور انہیں نتائج بھگتنے دھمکیاں بھی دیں جس کی وجہ سے یہ اپنی زندگی خطرے میں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ازراہ کرم ابھی تک لندن پولیس اور انتظامیہ کو اس واقعے سے آگاہ نہیں کیا کیونکہ یہ یونیورسٹی کی بدنامی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے یہ پہلے میرے پاس آئے ہیں تاکہ انہیں انصاف فراہم کیا جائے۔ تمہارا اس بارے میں کیا کہنا ہے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے انہیں کبھی ہراساں نہیں کیا نہ ہی کبھی دھمکانے کی کوشش کی ہے۔“

”تمہارے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت ہے۔“

”بے گناہی کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ثبوت الزام لگانے والے کو دینا پڑتے ہیں سر۔۔۔۔۔“

پہلی بازی

دوسرے دن صبح جب میں یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تبھی مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ آج فضا کچھ بدلی بدلی سی ہے۔ سب سے پہلے مجھے جم (Jim) نظر آیا، مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بولا۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔ تم فکر مت کرنا میں Man۔۔۔۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ پوری یونیورسٹی کو ہلا کر رکھ دیں گے۔“

کچھ دیر میں ہی کلاس کے باقی طلبا بھی میرے گرد بھیڑ کی صورت میں جمع ہو گئے، سب ہی اپنی اپنی بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ سبھی میرے ساتھ ہونے کا اور ساتھ دینے کا وعدہ کر رہے تھے۔ میں کچھ سمجھا اور کچھ سمجھ نہیں پایا۔ اتنی دیر میں میرا نام اسپیکر پر پکارا جانے لگا۔ ڈین آئزک کے کمرے میں میری طلبی کی جارہی تھی۔ میں آئزک کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر کمرے میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر سنٹرل اسکوائر کی لائبریری کے انچارج پیٹر پر پڑی۔ جس کے ہونٹوں پر مجھے دیکھتے ہی ایک طنزیہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ کمرے میں اس کے علاوہ اس وقت صرف سر آئزک ہی موجود تھے۔

”آؤ حماد۔۔۔۔۔ مجھے اُمید ہے تم نے آج یونیورسٹی آنے کے بعد نوٹس بورڈ پر لگا اپنے خلاف نوٹس سب سے پہلے پڑھا ہوگا۔“

اوہ۔۔۔ تو یہ بھیڑ جو باہر میرے گرد جمع تھی وہ اس نوٹس کی وجہ سے تھی۔

”نہیں سر۔۔۔۔۔ میں ابھی پہنچا ہی ہوں۔۔۔۔۔ آپ ہی مجھے کچھ بتائیے اس نوٹس کے بارے میں۔“

”اس سے پہلے میں تم سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہوں گا۔ اگر تم کسی تعلیمی ادارے کے انتظامی سربراہ ہوتے اور تمہارے علم میں یہ بات آتی کہ تمہارے زیر انتظام تعلیمی

نے جو وہ میرے خلاف کر رہی تھی۔ ان سب میں تجسس کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ آخر ایک معمولی اور عام طور پر یونیورسٹی کی لائبریری کے طاقوں میں مٹی اور گرد کے نظر ہو جانے والے اس ٹرم پیپر میں، میں آخر کیا بات لکھنا اور کہنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے آئے دن مجھے گھبرانے کے لیے نئے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ اور یہی سر آئزک کی بنیادی غلطی تھی۔ انہوں نے طلباء کے اس تجسس کو ہوا دے دی تھی۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ اگر مجھے روزمرہ کے معمول کی طرح خود اپنا ٹرام پیپر پڑھنے اور پیش کرنے کی اجازت دی جاتی تو شاید وہ متنازعہ تو ضرور ثابت ہوتا لیکن اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو اب بن پڑھے اور پیش کیے ہی دھیرے دھیرے طلباء کے ذہن پر ہو رہا تھا۔

اسی شام جب میں نہر کے کنارے اپنے پسندیدہ بیچ پر بیٹھا سامنے نہر میں تیرتے پرندوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ربیکا شاید مجھے ڈھونڈتے ہوئے ہی وہاں آنکلی، دُور سے اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ میری طرف چلی آئی۔ کالے اسکرٹ پر اس نے سفید پھولوں والی بہت خوبصورت سی قمیض پہن رکھی تھی اور اس لباس میں وہ خود بھی کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سو جھی سو جھی سی تھیں۔ جیسے بہت دیر تک روتی رہی ہو۔ بہت دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے، پھر وہ دھیرے سے بولی۔

”کیا میں تم سے معافی مانگنے کا حق اب بھی رکھتی ہوں؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”دوست ہر حق رکھتے ہیں، سوائے معافی مانگنے کے حق کے، یہ حق انہیں کبھی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دوستی میں اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ دوست کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا تو پھر معافی کیسی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ غلطی تو میری بہت بڑی تھی۔۔۔۔۔ لیکن میں جانتی تھی کہ میڈی کا ظریف کتنا بڑا ہے اور وہ آگے سے مجھے میری معذرت کا کیا جواب دے گا۔“

”جانے دو ان باتوں کو۔۔۔۔۔ اتنے دنوں کے بعد بات کی ہے تو کچھ اور کہو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کبہ لینے دو۔۔۔۔۔ ورنہ یہ کاٹا میری روح میں ہمیشہ چبھتا رہے گا۔ اس دن جب تم نے مجھے یہ کہا تھا کہ کوئی پہلے سے تمہارے دل و جان پر قابض ہے تو مجھے

انہوں نے سارہ کے بکھرے بال اور اس کا میری طرف دیکھ کر مسکراتا دیکھا۔ اک لمحے کو ان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا لیکن انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پانا خوب سیکھ رکھا تھا۔ انہوں نے پیٹر کو الوداع کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ پیٹر سارہ سے نظر چُراتا ہوا دوسری جانب سے نکل گیا۔

اگر بابا کو پتہ چلتا کہ میرے ٹرم پیپر نے پورے لندن کے یہودیوں کو کس مشکل میں ڈال دیا ہے تو جانے وہ کیا سوچتے۔ ہمارے گھر میں مذہب کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ ہمارے گھر میں پانچ وقت کی نماز تو دور کی بات ہے جمعہ اور عید پر بھی برائے نام اور دکھاوے کے لیے عید گاہ جانے کا رواج تھا۔ قرآن کو ہمارے ہاں صرف اونچے طاق پر سجا کر رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا تھا۔ آخری مرتبہ شاید اُسے میری بڑی بہن کی رخصتی کے وقت اس کے سر پر رکھنے کے لیے اس طاق سے اُسے اتارا گیا تھا۔

مجھے اپنے لڑکپن کی ایک بات ہمیشہ یاد رہے گی۔ جب میں پندرہ سولہ سال کا تھا، ٹھیک آج سے قریب اُس سال پہلے، تب میری کلاس کی ایک ہندو لڑکی کامنی پر میرا دل آ گیا تھا۔ ایک دن وہ ہمارے گھر آ گئی تھی، شاید میری سالگرہ کا دن تھا۔ اس وقت ہمارے گھر روز پڑھانے کے لیے آنے والے مولانا صاحب آئے ہوئے تھے جنہوں نے عصر کے وقت ہمیں زبردستی وضو کرا کر اپنے ساتھ نماز کے لیے کھڑا کر رکھا تھا۔ جیسے ہی میری نظر کامنی پر پڑی، میں نے جلدی سے نماز توڑ دی تھی تاکہ کامنی کو یہ نہ پتہ چلے کہ میں نماز بھی پڑھتا ہوں۔ صرف کامنی پر ہی کیا منحصر تھا میں اب تک بھی اپنی کسی لڑکی دوست کے سامنے نماز پڑھنے سے کتراتا تھا۔ پتہ نہیں میرے دل میں ایک عجیب سی جھجک تھی کہ مجھے اپنی گرل فرینڈز کے سامنے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ اس سے میرا اثر ان کی نظر میں خراب ہو جائے گا۔

اس دن جب میں نے بابا کو کامنی کے آنے اور میرا اپنی نماز توڑ کر بھاگ کر بڑے کمرے میں چھپ جانے کا واقعہ سنایا تو وہ بہت دیر تک ہنستے رہے تھے۔

اس دن جب پیٹر یونیورسٹی آیا تھا، مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ طلباء کی بہت بڑی تعداد اب خود میرا ٹرم پیپر سننا چاہتی تھی، پڑھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ انتظامیہ کے پے در پے اقدامات